تدوین کی کوئی مستحکم بنیاد باقی نہیں رہے گی ایک طرف تو جدت پسند طبقہ ماضی کی تمام تعبیروں کو غلط قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سرسید احمد خاں جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کی تعبیر و تشریح کو اس طرح پیش کرتا ہے، جیسے وہ عین وحی الٰہی ہیں، ڈاکٹر طاہر محمود نے مسلم ممالک میں ہونے والی قانونی اصلاحات کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے مسلم پرسنل لا میں اصلاح و تبدیلی کی جانب دبی زبان سے اشارہ کیا ہے، دراصل فکر اسلامی کی تشکیل جدید، علم کلام کی نئی تعبیر اور اجتہادی مسائل میں اسلام کی روح اور کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت مسلّم ہے اور اس کا عام احساس بھی پیدا ہوگیا ہے لیکن اس نازک اور اہم کام کو انجام دینے کے لیے اشخاص کے انتخاب، تشکیل جدید کی تعیین، جدید دور کے تقاضوں اور تبدیلی کی نوعیت و حدود میں بڑی حد تک اختلاف رائے ہے، جس کو ایک اجماع بن، طے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے جدید و قدیم علوم کے ماہرین کو بار بار اکٹھا ہونا ہوگا، اس سمینار نے اس کی بنیاد ڈالی ہے، اگر کام اخلاص، احتیاط اور غور و فکر کے ساتھ ہوتا رہا تو اس بنیاد پر آئندہ اسلامی نظام کا خاکہ بن سکے گا،

**شجرۂ طیبہ**، مرتبہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۰۲ مع گرد پوش، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس،

حضرت شاہ طیب بنارسیؒ گیارھویں صدی ہجری کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کا خانوادہ ان مدتوں علم و عرفان اور رشد و ہدایت کا گہوارہ رہا جس سے اس نواح کے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا اس کتاب میں حضرت شاہ طیبؒ کے علاوہ ان کے علمی و روحانی خانوادہ کے دوسرے بزرگوں نیز خلفاء، مریدین اور متوسلین کے حالات و کمالات بھی مستند طور پر بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے کہیں کہیں اس میں بعض معاصر اہل قلم کی غلطیوں کی تردید بھی کی ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۹ء عدد ۳

## مضامین



### مقالات



---

# شذرات

انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کا دوسرا سالانہ اجلاس گذشتہ فروری میں دہلی میں ہوا جس کی صدارت مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ تاریخ کے مشہور اور جید پروفیسر جناب خلیق احمد نظامی نے کی، اس میں انھوں نے جو اپنا پُر مغز صدارتی خطبہ پڑھا، وہ اُن کی زندگی کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جائے گا، اس سے اس اجلاس کے وزن اور وقار میں بھی اضافہ ہوا ہوگا،

انھوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ کہا کہ اب جب کہ ہمارے ملک کی زندگی کی ایک نئی تاریخ بن رہی ہو تو ہماری تاریخ نویسی میں فرقہ واریت، علاقائیت، نسلی عداوت، مذہبی حقارت کا اظہار نہ ہو، باہر سے درآمد کئے ہوئے نظریات پر بھی مبنی نہ ہو بلکہ اس میں صرف حق و صداقت ہو، انھوں نے متوازن تجزیہ کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلائی کہ ہمارے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پہلے تو انگریزوں کے سامراجی مصالح کی نذر ہوئی، اور اب یہی تاریخ کارل مارکس کی عینک چڑھا کر لکھی جارہی ہے، ماضی کی تاریخ ماضی کے ماحول میں لکھی جانے کے بجائے حال کے نظری اور فکری رجحانات کے مطابق قلمبند ہورہی ہے، جس سے اس دور کی ساری مذہبی، روحانی، اخلاقی، اور تاریخی قدر و قیمت پامال ہورہی ہے، اس خطبہ میں موثر دلائل اور انداز بیان کے ساتھ جو بالغ نظری، رواداری، اور سلامت روی ہے وہ اگر ہمارے ملک کے تمام مورخین میں پیدا ہوجائے تو غلط قسم کی تاریخ نویسی سے جو ذہنی امراض پیدا ہوگئے ہیں ان کا خاطر خواہ مداوا ہوجائے،

تاریخ نویسی کا مقصد حال کو ماضی کی ناگواری بڑھا کر برباد کرنا نہیں ہوتا، اس میں حکومتوں کی کہانی اور قوموں کی سوانح عمری اس لئے لکھی جاتی ہے کہ متقدمین کے حالات کا علم متاخرین کو ہو، امور جہانداری اور جہانبانی کی اچھائیوں اور برائیوں کے نتائج بعد کی نسلوں کے لئے سرمایۂ بصیرت و عبرت بن کر قومی زندگی کی سیرت بنانے میں معاون ہوں، استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کا قول ہے کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے اس کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر آپ جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں، اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہیں رنگ کر دکھا سکتے ہیں، اس کے ذریعہ ہندوستان کے متفرق اجزا جوڑے بھی جاسکتے ہیں اور توڑے بھی جاسکتے ہیں،



بدقسمتی سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھنے میں دلوں میں وصل پیدا کرنے کے بجائے ان میں فصل پیدا کرنے کا کام زیادہ لیا گیا ہے، مسلمان حکمرانوں کے دور میں تاریخیں حاکمانہ اور فاتحانہ پندار میں قلمبند ہوئیں، جن کی بعض تحریروں سے ہندوؤں کے دلوں کو دکھ پہنچنا لازمی ہے، مگر اس کے لئے یہ معذرت پیش کی جاسکتی ہے کہ اس دور کی تاریخ نویسی میں مڈیوالزم کا رنگ غالب رہا، انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں جو تاریخیں لکھوائیں، اس کے لئے بھی یہ عذر ہوسکتا ہے کہ ان کو اپنی امپیریلزم کی مقصد برآری اس طرح کرنی تھی کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں کے شیشے ٹوٹ کر جڑنے نہ پائیں، کارل مارکس کے نظریوں سے مرعوب ہوکر جو مورخین تاریخیں لکھ رہے ہیں، وہ زیادہ لائق اعتنا اس لئے نہیں ہیں کہ اُن پر کمیونزم کا بھوت ایسا سوار ہے کہ وہ دنیا کی ساری مذہبی، روحانی اور تاریخی روایات کو دریا برد کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، مگر اس ماڈرنزم کے دور میں ان مورخوں کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے، جن کی تاریخیں پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہو کہ جو بدلہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں سے میدان جنگ میں نہیں لیا گیا تھا، وہ ان کی تاریخوں کے صفحات میں لیا جارہا ہے،

سرجدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر پانچ جلدیں لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی، اورنگ زیب کو برا ثابت کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے مذہب پر بھی یہ لکھ کر اوچھا وار کیا کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے، جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے لگے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیروؤں کو ڈاکہ زنی، اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا، (اورنگ زیب جلد سوم ص ۲۴۸-۶۴)

یہ نفرت اور اشتعال سے بھری ہوئی بلکہ دکھ پہونچانے والی تحریر انگریزوں کے عہد حکومت میں لکھی گئی، جس کے متعلق یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے لکھی گئی، لیکن آر سی مجمدار آج کل بڑے مقبول اور مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی ایک تحریر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ملیچھ بتا کر اُن کی یہاں کی آمد کو ایک المیہ قرار دیا، اور اس دکھ کا اظہار کیا کہ شیخی بگھارنے والے ہندو راجاؤں نے مل کر اس کی کوشش نہیں کی، کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر اپنے گوشت کا کانٹا نکال پھینکتے، اور اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف توجہ نہیں کی، کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کرا لیتے، (ہسٹری

اینڈ کلچر آف انڈین پیپل جلد پنجم تمہید ص ۷ ، ۷ × ۷)

---

اگر یہ تحریر مذہبی تعصب نسلی غیظ و غضب یا حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے نشہ میں لکھی گئی، تو پھر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے مورخوں کی ایسی تحریریں قابل مواخذہ نہیں ہو سکتی ہیں جن سے ہندوؤں کے "آبگینۂ دل کو ٹھیس لگتی ہے"، انھوں نے بھی جو کچھ لکھا مذہبی تعصب اور حکمرانی کے غرور ہی میں لکھا، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ ازمنۂ وسطیٰ کے عہد سپہگری میں لکھی گئیں مگر مذکورۂ بالا تحریر قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی، ثقافتی موانست اور وطنی محبت کے دور میں قلم بند ہوئی، ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے ہندوستان میں ہم وطن ہو کر رہ رہے ہیں، مسلمانوں نے بھی یہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا رکھا ہے، دونوں کو یہیں جینا اور مرنا ہے تو کیا ایک دوسرے کی مذہبی، روحانی، اور تاریخی قدروں میں رخنہ گری ملک کے ساتھ بے وفائی نہیں ایسے محل پہ دہ ستور رخنہ گری ہے خود کشی

ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

---

ہندوؤں نے تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں ہی سے سیکھا، انھوں نے اس کو سیکھ کر اپنے وطن کے عہد قدیم کی تاریخ کو ایک متمدن ترین قوم کی تاریخ بنا دی، مگر وہ جب اپنے اسی وطن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھتے ہیں، تو اس میں ہمدردی کے بجائے بے دردی کی رخنہ گری زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس ضرر رسانی کے انسداد کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا ہم خاموش رہیں کہ ہمارا ماضی نفرت انگیز طریقہ پر پیش ہوتا رہے، یا ہم خود اپنے ماضی کی تاریخ کی مذہبی، روحانی، معاشرتی، نفسیاتی، اور سیاسی عظمت کو اس طرح پیش کریں کہ اس میں صداقت، واقعیت اور معروضیت کے آبدار موتی جھلملاتے بھی نظر آئیں، اور کسی کے آبگینۂ دل میں بال بھی نہ آئے، آج کل تاریخ لکھی نہیں جاتی ہے، بنائی جاتی ہے، ہم اپنی تاریخ بنائیں نہیں، بلکہ لکھیں، تاکہ ہم بھی بنیں، اور ہمارا ملک بھی بنے،

---

معارف کا زیادہ تر حصہ لکھا جا چکا تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے بہت پرانے رکن تھے، اُن کی وفات سے یہ ملک ایک شریف ترین انسان، ایک خلیق بزرگ، ایک اچھے دوست اور ایک بہت ہی نامور مصنف سے محروم ہو گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، معارف کی آیندہ اشاعت میں ان شاء اللہ اُن پر ایک مفصل مضمون ہو گا۔



# مقالات

## امیر خسروؒ اور افضل الفوائد

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

امیر خسروؒ نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے کچھ ملفوظات افضل الفوائد کے نام سے جمع کیے، اگر کچھ محققین ایسے بھی حال ہی میں پیدا ہو گئے ہیں جو اس خیال کے ہیں کہ اس کو امیر خسروؒ نے خود مرتب نہیں کیا بلکہ ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، اگر یہ پر زور طریقہ پر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کو امیر خسروؒ نے جمع نہیں کیا تو اس سے زیادہ طاقتور طریقہ پر یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ امیر خسروؒ ہی نے اس کو ترتیب دیا۔

خواجگان چشت میں سے حضرت عثمان ہرونیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات کے مجموعوں کے ساتھ افضل الفوائد کو بھی سب سے پہلے پروفیسر محمد حبیب (سابق استاد تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انگریزی رسالہ مڈیول انڈیا کوارٹرلی (علی گڈھ) میں جعلی، نقلی اور فرضی قرار دیا، اس کا جواب راقم نے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۶۲ء کے معارف میں دیا، جو میری کتاب بزم صوفیہ کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں بھی شامل ہے، اس جواب سے یہ اثر ہوا کہ ایک علمی حلقہ ان ملفوظات کے مجموعوں کو قطعی طور پر جعلی، نقلی اور فرضی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

۱۹۷۸ء میں دہلی کے رسالہ منادی کا حضرت بابا فرید نمبر شائع ہوا جس میں پروفیسر محمد حبیب کی آواز بازگشت پھر سنائی دی، جناب نثار احمد فاروقی، شعبۂ عربی دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی نے بھی راحت القلوب، اسرار الاولیا اور فوائد السالکین کو جعلی اور فرضی ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر جب انھوں نے خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی کی کتاب شمائل الاتقیا و رذائل الاشقیا میں راحت القلوب کا حوالہ دیکھا تو انھوں نے دسویں یا گیارہویں صدی میں راحت القلوب کے گڑھے جانے کے خیال سے رجوع کیا، مگر یہ بھی اسی کے ساتھ لکھا ہے کہ اگرچہ ابھی تک اس کتاب کے مستند ہونے کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ مطمئن نہیں ہوں (منادی حضرت امیر خسروؒ نمبر ص ۷۹) منادی کے امیر خسروؒ نمبر میں جناب نثار احمد نے امیر خسرو کی افضل الفوائد پر بھی بحث کی ہے، جس کے مطالعہ سے کوئی اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا ہے کہ انھوں نے اسکو اصلی قرار دیا ہے یا نقلی، اس کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو جعلی قرار دینا چاہتے ہیں، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں (یعنی افضل الفوائد اور راحت المحبین) کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا ہوں کہ بعض شواہد ان کے حق میں مل جاتے ہیں (ص ۷۷) پھر اسی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ یہاں میں نے دونوں کتابوں کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کردیا ہے، جن دلائل کی بنیاد پر ان کتابوں کو جعلی سمجھا گیا ہے ان کے ساتھ ہی وہ پہلو بھی پیش کردیئے ہیں جن سے ان کا پایۂ استناد معتبر ہوتا رہا ہے لیکن جب تک ان دونوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے سامنے نہ ہوں، یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں قطعاً جعلی سمجھا جائے یا امیر خسروؒ کی مستند تصانیف میں ان کا شمار کیا جائے، ایک دشواری یہ ہے کہ ان کا متن تحقیق کے ساتھ مرتب ہوکر ابھی تک نہیں چھپا ہے



اور جو تراجم شائع ہوئے ہیں، ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا (ص ۸۰)

جناب نثار احمد فاروقی کو اگر یقین تھا کہ افضل الفوائد جعلی ہے تو اس کو پروفیسر محمد حبیب کی طرح وثوق کے ساتھ ایسا ہی ثابت کرنا چاہیئے تھا، اور اگر اس کے جعلی ہونے میں شک تھا تو اپنے اس مضمون کے شائع کرنے میں عجلت نہ کرتے، خوامخواہ اپنے ناظرین کو اس ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیا کہ یہ جعلی بھی ہوسکتا ہے اور مستند بھی۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام ملفوظات کو جعلی ثابت کرنے کی مہم کیوں چلائی گئی ہے اگر ایسی ساری باتیں محض حقیقت پسندانہ تحقیق کی خاطر لکھی گئی ہیں تو ایسے محقق کے متعلق کیا رائے ہے جنہوں نے ایسی ہی تحقیق کی آڑ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کربلا کا واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ امام حسینؓ کربلا میں مدفون ہی نہیں، آج کل ایک حلقہ میں معروضیت سے بھری تحقیقی مہم جاری ہے کہ آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کو شاہجہاں نے نہیں بنوایا، بعض حلقوں میں تو یہ بھی ثابت کیا جارہا ہے کہ امیر خسروؒ نہ صوفی تھے اور نہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، ایک صاحب نے تو یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جہاں مدفون ہیں وہ ان کا اصلی مرقد نہیں، کچھ ایسے بھی محققین ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت علاء الدین صابرؒ جیسے بزرگ کی کوئی شخصیت ہی نہیں، کلیر شریف میں ان کا مزار فرضی ہے، ایسی تحقیقات کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ بعض تلوار کے دھنی خوامخواہ فساد فی الارض برپا کردیتے ہیں، اسی طرح قلم کے بعض پرجوش دھنی اپنی تحقیقی سرگرمیوں سے فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایت اور فساد فی الرسوخ فی العقیدہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خواجگان چشت کے جن ملفوظات کو جعلی اور فرضی قرار دیا جاتا ہے، اس کا مخفی

قیاس ایک بہم اور غیر واضح بیان سے کیا جاتا ہے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مجموعۂ ملفوظات خیر المجالس کی مجلس یازدہم میں ہے کہ اس کے مرتب حمید قلندر نے عرض کیا کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس سرہٗ العزیز سے عرض کیا کہ

"من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ"

تو حضرت شیخ نے فرمایا

او تفاوت گفتہ است من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند"

لیکن حمید قلندر نے فوائد الفواد کے جس ملفوظ کا ذکر کیا ہے وہ اس کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں نہیں کہ خواجگان ما نیز نہ کردہ اند (ص ۵۴)

اس راقم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ مجموعۂ ملفوظات کو کوئی مستقل تصنیف قرار نہیں دیتے تھے کیونکہ فوائد الفواد ہی میں ہے کہ انھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات جمع کیے جو ششہ تک ان کے پاس تھے (فوائد الفواد ص ۲۰۳) اور اگر انھوں نے جمع کیے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مرشد کے ملفوظات جمع کرنے کی روایت تھی اور اگر جمع کرنے کی روایت نہیں تھی، اور ان سے پہلے کے خواجگان چشت اپنے ملفوظات کو جمع کرانا پسند نہ کرتے تھے، تو پھر خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے حسن سجزی کو اپنے ملفوظات جمع کرنے کی کیوں اجازت دی؟ اس سے تو ان کے مرشد اور مرشد کے مرشد کی روایت کی خلاف ورزی ہوئی اور جب ان کے ملفوظات جمع ہوئے تو پھر ان کے پیشرو خواجگان چشت کے ملفوظات کے جمع ہونے سے انکار کیوں کیا جائے۔

ان ملفوظات کے منکرین بیسویں صدی عیسوی ہی میں پیدا ہوئے اس سے پہلے



ان مجموعوں کو کسی نے جعلی قرار دے کر رد نہیں کیا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ بلکہ اس سے پہلے بھی ان سے استفادہ کیا جاتا رہا، راقم نے اب سے بہت پہلے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سیر الاولیا چشتیہ سلسلہ پر قدیم ترین تذکرہ ہے، اس کے مولف امیر خورد امیر خسرو کے معاصر ہیں، ان کا جا بجا بیان ہے کہ

"در ملفوظات شیخ الاسلام شیخ معین الدین سجزی نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۶)

"کاتب حروف در ملفوظات حضرت شیخ الاسلام معین الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز نبشتہ دیدہ است (ص ۴۹)

"در بیان بعضے ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق قدس اللہ سرہٗ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ العزیز بخط مبارک خود در قلم آوردہ ۔ ۔ ۔ (ص ۷۴)

"بزرگے از ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز با نعمہ کلہ جمع کردہ است از ان چند کلمہ آوردہ شد (ص ۷۶)

کیا یہ تحریریں جھوٹی ہیں اگر جھوٹی نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات مرتب ہوئے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ مفتاح العاشقین مرتبہ مولانا محب اللہ ہے، یہ مطبع مجتبائی دہلی میں چھپ گیا ہے، اس میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی زبانی انیس الارواح (ص ۱۰) دلیل العارفین (ص ۳۰) اور اسرار الاولیا (ص ۱۵) کے حوالے موجود ہیں، مگر مفتاح العاشقین کو بھی خواہ مخواہ جعلی مجموعہ قرار دیا گیا ہے، پھر ظاہر ہے کہ اس کی روایت کیسے قابل قبول ہوگی، جناب نثار احمد فاروقی نے خود اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضرت امیر خسرو کے انتقال کے چودہ سال کے بعد حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے حکم سے شمائل الاتقیاء ودلائل الاشقیاء لکھی گئی ہے، اس میں بھی انیس الارواح دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار المتحیرین کے علاوہ راحت المحبین ملفوظ شیخ نظام الدین جمع و تالیف امیر خسرو کا بھی ذکر ہے (ص ۷۰، شمائل الاتقیا حیدرآباد میں ۱۳۴۷ھ میں چھپ گئی تھی، اسکے مطبوعہ نسخہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے)

حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کا ابتدائی زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ ہی کا تھا، ان کی وفات ۷۸۲ھ میں یعنی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وصال کے ۵۷ سال بعد ہوئی ان کے مجموعۂ ملفوظات خوان پر نعمت میں صاف طور پر ذکر ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جمع کیا ہے۔ (ص ۸۸) اسی طرح ان کے مجموعہ ملفوظات مخ المعانی، میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کے حوالے ہیں، (ص ۷۹-۵۱) ان سے حضرت شرف الدین یحیٰ منیریؒ نے استفادہ بھی کیا، پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مطالعہ میں بھی یہ ملفوظات رہے، انھوں نے واضح طور پر اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے ملفوظات جمع کیے (ص ۲۲-۲۵) اور حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ نے مکتوب کیے" (ص ۵۲)

جب ان ملفوظات سے صدیوں تک استفادہ کیا جاتا رہا تو اب ان کو جعلی اور فرضی قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، اس راقم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی یہ اعادہ کرتا ہے کہ جن دلائل کے ساتھ خواجگان چشت کے ملفوظات جعلی قرار دیئے جارہے ہیں، ان ہی کی روشنی میں فوائد الفواد، خیر المجالس اور جوامع الکلم کا مطالعہ کیا جائے تو ان پر بھی ایک ناقد اپنی عیب جوئی اور خردہ گیری سے اسی قسم کے اعتراضات کرسکتا ہے جس طرح کہ خواجگان چشت کے ملفوظات پر کیے جارہے ہیں، ایک حلقہ تصوف ہی کا منکر ہے، اور تصوف کے سارے لٹریچر کو



غیر اسلامی سمجھتا ہے تو پھر جو روحانی سرمایہ ہم کو ورثہ میں ملا ہے اس کو اپنی ذہنی عیاشی میں تحقیقات کے نام پر دریا برد کرنے میں کون سی مفید خدمت ہوگی، یہ سوچنے کی بات ہے،

ملفوظات کے مذکورۂ بالا مجموعے کسی ریسرچ روم میں قلمبند نہیں کیے گئے۔ ان کا انداز بیان مورخانہ، محققانہ، اور ناقدانہ نہیں، ان میں جو باتیں قلمبند ہوئیں، وہ مریدوں کی مجلسوں میں کہی گئیں، جن کا انداز واعظانہ، ناصحانہ اور معلمانہ ہوتا، مریدوں کے جذبات کو ابھارنے اور ان کے احساسات کو متاثر کرنے کے لیے بعض اوقات ایسی تفسیر، ایسی حدیث، ایسی روایت، ایسی کرامت، ایسے تاریخی واقعات، اور ایسے مشہور قصوں کا سہارا لیا جاتا جن کا سو فیصدی صحیح ہونا ضروری نہیں ہوتا اسی لیے مستند سے مستند مجموعۂ ملفوظات کو تاریخی تحقیق اور عقل کی خراد پر چڑھا دیا جائے، تو اس میں بہت سی باتیں قابل قبول نہ ہونگی بعض تو ایسی ہیں جو موجودہ دور کی کسی مجلس میں بیان نہیں کی جاسکتی ہیں، مثال کے لیے دیکھو فوائد الفواد مجلس سی و یکم ص ۱۳۰ (لاہور ایڈیشن) مولانا اشرف علی تھانویؒ کے عہد میں روایت و درایت اور تحقیق و تدقیق کا معیار بہت اونچا ہو چکا تھا وہ اپنی ایک مجلس میں فرماتے ہیں۔

"حضرت سلطان الاولیا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ کے ساتھ کسی مرید نے غلبۂ محبت میں بار بار یہ شعر پڑھا۔

سرو سیمینا بہ صحرا می روی          سخت بے مہری کہ بے ما می روی

اے تماشا گاہ عالم روے تو          تو کجا بہر تماشا می روی

اس کا یہ اشعار پڑھنا تھا کہ سلطان جی کی نعش کو وجد ہوا اور ہاتھ کفن سے باہر اونچا ہوگیا، اس پر لوگوں نے اس مرید کو خاموش کیا کہ یہ کیا غضب کرتے ہو قیامت برپا ہوجائے گی جنازہ کے ساتھ خاموشی سے چلو، دیر میں سکون ہوا، اور ہاتھ بدستور کفن کے اندر ہوگیا، دیکھئے اہل قبر

کو موت کے بعد بھی کیسی بے فکری حاصل ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی وجد و حال باقی رہا۔

(خیر الحیات و خیر المات ص ۵۰)

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا

قاضی ضیاء الدین سنامی حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدین کے ہم عصر ہیں سلطان جی صاحب سماع تھے۔ قاضی سنامی ان کو سماع سے منع کرتے تھے، ایک بار قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ سلطان جی کے یہاں سماع ہو رہا ہے تو وہ اپنی فوج کو ساتھ لے کر روکنے آئے یہاں پہنچ کر دیکھا تو ایک شامیانہ قائم تھا اور اس کے اندر سلطان جی کی جماعت کا اس قدر ہجوم تھا کہ قاضی صاحب کو اندر جانے کی جگہ نہ ملی انھوں نے حکم دیا کہ خیمہ کی طنابیں کاٹ دو تاکہ مجمع منتشر ہو جائے، فوج نے خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں مگر خیمہ اسی طرح ہوا پہ معلق رہا مگر انھیں قاضی صاحب نے اپنی جماعت سے فرمایا کہ اس سے دھوکہ نہ کھانا بدعتی سے خوارق کا صدور ہو سکتا ہے اور یہ موجب قبول نہیں، اس وقت تو وہ واپس ہو گئے دوسرے وقت حضرت سلطان جی کے مکان پر گئے اور فرمایا کہ تم سماع سے توبہ نہ کرو گے، سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوا دیں جب تو تم منع نہ کرو گے کہا اچھا پچھوا دو، قاضی صاحب کو سلطان جی کی بزرگی کا علم تھا، جانتے تھے کہ یہ حضور کی زیارت کرا سکتے ہیں اس لیے سوچا کہ اس دولت کو کیوں چھوڑا جائے، سلطان جی نے ان کی طرف توجہ کی تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت مکشوف ہوئی کہ حضور ان سے فرما رہے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ (الحدود والقیود ص ۳)

کیا یہ روایتیں صحیح ہیں؟ اگر صحیح نہیں تو پھر کیا ایسی کتابیں جن میں یہ درج ہیں، جعلی قرار دی جائیں گی؟ اگر افضل الفوائد جعلی ہے تو اس سوال کا کیا جواب ہے کہ کسی نے اس کو اتنی محنت سے مرتب



کرنے کے بعد امیر خسرو سے کیوں منسوب کر دیا؟ ان سے منسوب کرنے میں کیا غرض تھی؟ کیا ان کا رتبہ بڑھانا مقصود تھا؟ ان میں کس چیز کی کمی تھی جو اس کے انتساب سے ان کا رتبہ بڑھ جاتا؟ اور پھر وہ کون سے ایسے صوفیائے کرام کی جماعت تھی جو ملفوظات کے مجموعوں کے گڑھنے کی مہم میں مشغول رہی اور کسی کو کانوں کان ان کی خبر نہیں ہوئی اور اب تک بڑے بڑے پروفیسر اور محققین کو یہ سراغ نہ مل سکا کہ ان مجموعوں میں جو روایتیں ہیں وہ آخر کہاں سے سرقہ کی گئیں اکا دکا روایتوں کی مماثلت سرقہ کی کوئی دلیل نہیں، کسی روایت کو کسی دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں دہرایا جانا بھی سرقہ کا ثبوت نہیں بزرگان دین ایک ہی روایت کو بار بار دہرایا کرتے تھے۔

ایک عرصہ تک عام خیال تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا، جس کو نولکشور پریس نے چھاپ بھی دیا تھا، مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس دیوان کی اکثر غزلیں مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی کی تصانیف معارج النبوت اور تفسیر فاتحہ میں بھی پائی جاتی ہیں، تو پھر یقین ہو گیا کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے نام سے جو مجموعۂ کلام چھاپا گیا ہے وہ دراصل ان کا نہیں، اسی طرح سلاطین دہلی کے عہد کا ایک شاعر تاج الدین ریزہ کے مجموعۂ کلام میں انوری کے بہت سے اشعار شامل کر دیئے گئے تھے، لیکن اہل نظر نے اس کی طرف توجہ دلائی تو پھر تاج الدین ریزہ کے بجائے یہ اشعار انوری کے سمجھے گئے۔ اسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ افضل الفوائد کی اکثر و بیشتر باتیں دوسرے ملفوظات میں ہو بہو اور لفظاً یہ لفظ ملتی ہیں تو یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ اس کو امیر خسرو نے ترتیب نہیں دیا، مگر محض قیاسات، ظنیات، ماہرانہ تاویلات اور "قوی ترشبہات" کی بناء پر ان کو جعلی قرار دینا بے انصافی ہے یہ دلیل نا قابل قبول ہے کہ اس کا حوالہ فوائد الفواد، درر نظامی، خیر المجالس وغیرہ جیسی قدیم تالیفات میں نہیں پایا جاتا، حضرت

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فیوض و برکات سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہو گیا، وہ وارث النبی فی الہند ہو کر یہاں جلوہ افروز رہے، مگر طبقات ناصری، تاج المآثر اور فخر مدبر کی تاریخ مبارک شاہی جیسی معاصر تاریخوں میں انکے کارناموں کا مطلق ذکر نہیں، ان کا اسم گرامی بھی ان تاریخوں کے صفحات میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا، اب کوئی عیب جو اہل قلم یہ دعویٰ کرے کہ ان کے کارناموں کو بعد کے تذکرہ نگاروں نے محض گڑھ لیا ہے تو یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی روحانی تاریخ پر شدید ضرب کاری لگائی ہو گی۔

منادی کے امیر خسرو نمبر میں بڑے وثوق کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات میں فوائد الفواد کے علاوہ ایک مجموعہ انوار المجالس سید محمد امام بن خواجہ بدر الدین اسحاق دہلوی نے مرتب کیا تھا، تیسرا اعز الدین صوفی نے تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار ترتیب دیا، اسے بھی حضرت نظام الدینؒ نے ملاحظہ فرما کر تصحیح کی تھی، چوتھا مجموعہ حضرت کے بھانجے ابوبکر مصلی بردار کے فرزند عبد العزیز نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا نام مجموع الفوائد رکھا تھا، پانچویں کتاب ملفوظات المشائخ تھی، جسے خواجہ شمس الدین دھاری نے ترتیب دیا تھا۔ زبان عربی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات پر ایک تالیف خلاصۃ اللطائف مولانا علی بن محمود جاندار نے لکھی تھی جس کا ایک اقتباس سیر الاولیا میں موجود ہے اور وہیں سے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے، ساتواں مجموعہ درر نظامی ہے، اس کے مولف یہی علی بن محمود جاندار ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا (ص ۷۶)

اگر یہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کے اصلی ملفوظات ہیں تو کیا ان کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ اطمینان کر لیا گیا ہے کہ ان سب کے حوالے فوائد الفواد، درر نظامی، خیر المجالس



سیر الاولیا اور جوامع الکلم جیسی قدیم تالیفات میں پائے جاتے ہیں، کیا یہ اسرائیلیات، قصص الانبیاء کے اقتباسات، مافوق الفطرۃ عناصر، غیر معمولی مجاہدات و کرامات اور مبالغہ آمیز فضائل کی مسلسل داستانوں سے خالی ہیں؟ کیا ان میں تاریخیں قلم بند کرنے کا وہی اہتمام ہے جو فوائد الفواد میں پایا جاتا ہے؟ کیا ان سے فوائد الفواد ہی کی طرح زندگی کی ہمک، دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل ہوتا ہے؟ کیا ان میں جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر غلط ہونے کے بجائے بالکل صحیح ہیں۔

اگر کوئی عیب جو اور خردہ گیر ناقد ان ملفوظات میں کچھ تھوڑی بہت باتیں وہی نکال دے جو مذکورۂ بالا ملفوظات خواجگان چشت میں نکالی جا رہی ہیں تو کیا یہ سب ملفوظات جعلی قرار نہ دیے جائیں گے؟ اور اگر یہ جعلی نہیں ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے ملفوظات جمع کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی، پھر امیر خسرو اس اجازت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے خصوصاً جب ان کو اپنے مرشد سے سرشارانہ اور والہانہ محبت تھی، ان کو امیر حسن سجزی کی فوائد الفواد پر اس حد تک رشک تھا کہ وہ کہہ اٹھے تھے کہ کاش امیر حسن سجزی ان کی تمام تصانیف ان سے لے لیتے اور فوائد الفواد ان کی طرف منسوب کر دیتے (سیر الاولیا ص ۳۰۸) اگر اسی رشک میں انھوں نے بھی اپنے مرشد کے ملفوظات کو جمع کرنا شروع کیا تو اس میں شک کیوں پیدا کیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا مجموعہ فوائد الفواد کی طرح مقبول نہ ہوا، وہ قصیدوں اور مثنویوں کے لکھنے میں اساتذۂ فن کا مقابلہ کرتے رہے، اگر اسی جذبہ سے وہ اپنے پیر بھائیوں کے مقابلہ میں اپنے مرشد کے مجموعۂ ملفوظات لکھنے لگے تو تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں، وہ اپنے مرشد کے ساتھ برابر رہتے، ان کے ملفوظات کو جمع کرنے کا شوق نہ پیدا ہوتا تو یہ تعجب کی بات ہوتی، یہ کہہ کر کہ "فوائد الفواد میں امیر خسرو کا

نام صرف ایک جگہ ضمناً" آیا ہے، ورنہ وہ حاضرین مجلس کے درمیان بھی نظر نہیں آتے، اگر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امیر خسرو اپنے مرشد کی مجلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوتے تھے، تو دونوں کے روحانی تعلقات پر خاک ڈالنا ہے، جب وہ اپنے مرشد کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے تو ان کے ملفوظات کو اگر قلمبند کیا تو یہ کون سی بعید از قیاس بات ہے، یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ امیر خسرو

خزائن الفتوح میں تو بہت ہی مرصع نگار ہیں، لیکن اعجاز خسروی کے رسائل میں انھوں نے فارسی نثر کے جو نمونے پیش کیے ہیں، ان میں کسی کا اسٹائل بھی افضل الفوائد سے نہیں ملتا، اگر یہ کہا جائے کہ امیر خسرو نے جیسا سنا ویسا ہی قلمبند کیا ہے جو عموماً جامعین ملفوظات کرتے بھی ہیں تو افضل الفوائد کے اسلوب کو فوائد الفواد کے طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیے" (ص ۴۸)

اس کے کہنے میں جو اعتراض وارد ہوتا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اوپر کی عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر جیسا سنا گیا ویسا ہی قلمبند کیا گیا تو پھر اس کا اسلوب فوائد الفواد سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اگر خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات کے مجموعوں کے اصلی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کا اسلوب بیان فوائد الفواد سے مشابہ ہو تو پھر خواجہ صاحب کے ان ملفوظات کے مجموعوں کا اسلوب بیان بھی فوائد الفواد ہی کی طرح ہونا ضروری ہے، جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اگر ان کا ایسا ہی اسلوب بیان ہے تو پھر یہ فوائد الفواد کی طرح مقبول کیوں نہیں ہوئے، اور اب تک لوگوں کی نظروں سے کیوں ایسے اوجھل رہے کہ صدیوں کے بعد ان کی نشاندہی کرنی پڑی؛ افضل الفوائد کے ناقدوں کے لئے شاید یہ بات قابل قبول نہ ہو، اگر یہ کہا



جائے کہ حسن سجزی کی علمی و ادبی سرگرمیاں امیر خسرو کے مقابلہ میں کم رہیں، ان کو کافی فرصت میسر تھی، اس لیے فوائد الفواد کو محنت سے مرتب کیا، اس کی نوک پلک کو درست کرنے میں برابر لگے رہے، امیر خسرو کا علمی و ادبی ذہن تو ایک مشین سے کم نہ تھا، اس سے جو سانچہ ڈھل کر نکل گیا، اسی پر انھوں نے اکتفا کیا، ان کے اہم ترین قصائد ہوں یا نظمیں، یا مثنویاں ہوں، ان پر کبھی ان کو نظر ثانی کر کے ترمیم، تنسیق یا اضافہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، جو جیسا ایک بار لکھ گیا وہی لوگوں کے سامنے آگیا، یہی بات افضل الفوائد کے متعلق کہی جا سکتی ہے، امیر خسرو نے اس کو مرتب کر دیا، پھر ان کو اسکی فکر نہیں رہی کہ اس کا اسلوب فوائد الفواد کے برابر ہے کہ نہیں۔

افضل الفوائد پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کی مجلسوں کی بیشتر تاریخوں کا مقابلہ تقویم سے کیا گیا تو مطابقت نہیں پائی گئی، مگر یہ اعتراض اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب جس تقویم سے مقابلہ کیا جائے، اس کو بالکل صحیح اور مستند تسلیم کر لیا جائے۔

اعتراض ہے کہ ۱۲ محرم ۷۱۳ھ تو تقویم کے لحاظ سے شنبہ ہونا چاہیے مگر وہاں یعنی افضل الفوائد میں اس تاریخ کو دن چہارشنبہ بتایا ہے (ص ۸۲) دار المصنفین میں جو قلمی نسخہ ہے اس میں بتاریخ دوازدہم روز شنبہ ماہ محرم الحرام ۷۱۳ھ ہی مرقوم ہے، اور بعد کی تاریخ بستم ماہ محرم ۷۱۳ھ روز یکشنبہ لکھی ہوئی ہے، اس طرح جس نسخہ میں چہارشنبہ دیکھا گیا ہے، وہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ان ملفوظات کی کتابت میں لاپروائی برتی گئی، جس سے غلط فہمی پیدا ہوئی، اگر مختلف نسخوں کو ملا کر ایسی غلطیاں دور کر دی جائیں تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوا، اور اگر تقویم کے لحاظ سے روز کا کہیں فرق ہو تو اس کو قمری مہینوں میں چاند کے ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کے دیکھنے کا فرق سمجھا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی سوچنے

کی بات ہے کہ جو جعل ساز ایسے ملفوظات مرتب کر سکتا ہے جن سے صدیوں تک لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتے ہیں، وہ تاریخ اور سنین قلمبند کرنے میں کیوں غیر محتاط اور لاپروا ہو سکتا ہے؟

افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی ایک قوی ترین شہادت یہ پیش کی گئی ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی ایک محفل سماع میں مولانا جمال الدین ہانسوی کی بھی موجودگی دکھائی گئی ہے جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے، پھر ان کے ساتھ ہی محفل سماع میں رقص کرنے والے شیخ عثمان سیاح ہیں جو شیخ جمال ہانسوی سے عمر اور مرتبہ میں بہت کم تھے، ان کے ساتھ محفلِ سماع میں وجد کرنا ادب کے خلاف تھا۔ (ص ۸۲) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مولانا جمال الدین ہانسوی حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ اول نہ تھے، بلکہ اسی نام کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، تو پھر یہ اعتراض جاتا رہتا ہے، اسی لیے یہ لکھنا صحیح تھا کہ وہ آئے، اور آداب بجا لا کر بیٹھ گئے، اور اپنے سے کم عمر حاضرین مجلس کے ساتھ رقص میں شریک ہو گئے،

یہ جواب اس خیال سے رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض حسن ظن پر مبنی ہے، مگر خواجگان چشت کے ملفوظات کو جعلی قرار دینے والوں کو اس خیال سے متفق ہونے میں تامل اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ ان کے سارے اعتراضات ظنیات ہی پر مبنی ہیں مگر اوپر کا بیان ظنیات سے خالی بھی ہے کیونکہ فوائد الفواد میں کئی جمال الدین مثلاً مولانا جمال الدین (ص ۱۸) جمال الدین نیشاپوری (ص ۱۰۹) اور خواجہ جمال ملتانی (ص ۱۵۳) کا ذکر ہے، ۷۰۸ھ کی مجلس دہم میں ہے۔

"جمعے از عزیزان چوں مولانا وجیہ الدین پائلی و مولانا حسام الدین حاجی و مولانا تاج الدین باد او و مولانا جمال الدین و یاران دیگر حاضر بودند (ص ۱۸)

ممکن ہے کہ یہی مولانا جمال الدین مراد ہوں، ہانسوی کا اضافہ غلطی سے ہو گیا ہو۔



ایک اعتراض یہ ہے کہ افضل الفوائد اور فوائد الفواد کی قریبی مجلسوں میں نہ وہ شخصیات نظر آتی ہیں، نہ وہ موضوعات ہیں جو امیر خسرو کے مرتب کردہ ملفوظات میں ملتے ہیں (ص ۸۲) اسی قسم کے ملفوظات کے نہ ہونے پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں، عام طور سے نئے موضوعات ہی زیادہ قلمبند کرنے کی کوشش کی جاتی مگر افضل الفوائد اور فوائد الفواد میں ملے جلے موضوعات کی کمی بھی نہیں، نماز عید الفطر، اصحاب سلوک، تصوف، توبہ، محبت، صبر، نفس درویش، سماع اور مختلف قسم کی نفل نمازوں پر دونوں مجموعوں میں ملفوظات ملیں گے مگر مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بالکل ملے جلے ہیں تو یہ کہا جائے گا کہ یہ سرقہ ہے اگر یہ ملے جلے نہیں ہیں تو کہا جائے گا کہ ویسے کیوں نہیں، اور اگر کچھ مختلف ہیں تو کہا جائے گا کہ یہ الحاقی ہیں، اس لیے کہ یہ فوائد الفواد میں نہیں ہیں، ان دلائل کے تشفی بخش جوابات کسی گوشہ سے نہیں مل سکتے،

یہ اعتراض بالکل بے جا ہے کہ افضل الفوائد میں وہ شخصیات نہیں ہیں جو فوائد الفواد میں ہیں افضل الفوائد میں جن حاضرین کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا جمال الدین، شیخ عثمان سیاح، مولانا برہان الدین غریب، شیخ حسین نبیرۂ شیخ بختیار اوشی، حسن سجزی، خواجہ عزیز ایبک، مولانا نصیر الدین کتابی، مولانا محمد، شیخ یوسف، اور مولانا علاء الدین چندیری وغیرہ

فوائد الفواد کی شخصیات یہ ہیں: ۱۰

مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا حسام الدین حاجی، مولانا تاج الدین، مولانا جمال الدین، مولانا سراج الدین حافظ بداؤنی، مولانا برہان الدین غریب، مولانا محمود اودھی، وغیرہ

افضل الفوائد میں شخصیات زیادہ ہیں، مگر کچھ مشترک بھی ہیں، افضل الفوائد میں زیادہ شخصیات ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں اسماء کے لکھنے میں فوائد الفواد سے نسبتاً زیادہ توجہ کی گئی ہے، فوائد الفواد

میں بعض اوقات بہت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے، بعض مجلسوں کا ذکر چند سطروں میں
ختم کر دیا گیا ہے، ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں دوسرے مجموعہ میں ذرا تفصیل سے ملتی ہیں جس سے
تشنگی فرو ہو جاتی ہے، مگر کچھ ناقدین ایسے ہیں جو یہ کہنے میں تامل نہیں کریں گے کہ جعلی ملفوظات میں
اس ایجاز کا اطناب کر دیا گیا ہے، مگر یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ فوائد الفواد سے پہلے کے ملفوظات
میں تفصیل موجود تھی، اس لیے فوائد الفواد میں اختصار سے کام لیا گیا، اختصار سے کام لینے کی
وجہ یہ بھی ہے کہ حسن سجزی خود اختصار پسند تھے، اسیلئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی باتیں بھی
اختصار سے لکھیں، یہ ان کی نثر نگاری کا اپنا انداز تھا، امیر خسرو کے یہاں نہ ان کی شعر و شاعری
اور نہ ان کی نثر نگاری میں ایجاز ہوتا اطناب ہی اطناب ہوتا اسی لیے فوائد الفواد اور افضل
الفوائد کے طرز نگارش میں یہ فرق ہونا تعجب انگیز نہیں، یہ حضرت خواجہ کے تخاطب کا اختلاف نہیں،
بلکہ ملفوظات کے قلمبند کرنے کے طرز کا اختلاف ہے

ایک اعتراض یہ ہے کہ جب امیر خسرو نے افضل الفوائد کا مسودہ حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاؒ کے ملاحظے کے لیے پیش کیا، تو اس وقت حضرت خواجہ نے جو کچھ فرمایا وہ فوائد الفواد
ہی کی عبارت ہے، اعتراض کے الفاظ یہ ہیں "ان دونوں بیانوں کا لفظاً و معناً ایک ہونا
خاصا قوی شبہہ پیدا کرتا ہے" (ص ۸۳)

اب ہم ناظرین کے لیے دونوں کی عبارتیں پیش کرتے ہیں

**افضل الفوائد:** ان روز بندہ چند چیز دکاغذ کہ الفاظ در بارہ گوہر نثار خواجہ
راستین را قلم آوردہ بود، پیش نظر مخدوم عالمیان بداشت و عرضداشت کرد کہ امروز
مدتست کہ این بیچارہ ہرچہ از زبان مخدوم می شنود ، آنجا کہ در ادراک فہم
یاری می دہد، ان را می نویسد و افضل الفوائد نام کردہ است، چون بندہ این عرضداشت



کرد بردست مبارک گرفت و بشرف مطالعہ شرف داد، در محلیکہ می رسید می فرمود کہ نیکو بنشتہ و نام
ہم نیکو نہادہ، و آنجا کہ سخن از بندہ ترک شدہ بود بر دست شریف بہ قلم مبارک آن جا را
صحیح می کرد، و بعد ازان رو بہ سوے حاضراں کرد و گفت کہ از خسرو بسیار است کہ این قدر
فوائد بہ قلم آوردہ است، آنکہ ہمہ وقت آن در بحر معانی از سرتا پا غرق است اما حق سبحانہ
تعالےٰ ہمہ اعضائی خسرو در معانی بکف می آرد و از آنجا می نویسد بعد ازان خواجہ ذکرہ اللہ
بالخیر بندہ نواز شکستہ پروری و بندہ نوازی کردہ، بندہ را بہ نواخت، بندہ برخاست
و سر بر زمین نہاد و گفت کہ در فہم این بیچارہ بخاطر جائے می دہد بہ برکت قوت اکرام
مخدوم عالمیانست، بہ نظر مبارک این بیچارہ را پرورش می دہد، الحمد اللہ علیٰ ذالک، بعد
ازان خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کلاہ خاص و پیراہن خاص بر بندہ عطا کردہ، بعد ازان سخن و بزرگی
شیخ معین الدین سجزی افتاد حکایت فرمود کہ ان روز شیخ معین الدین بخدمت شیخ عثمان ہارونی
نور اللہ مرقدہٗ پیوست و بیعت آورد و نیز بر فوائد کہ از زبان گوہر بیان شیخ می شنید ان
را بہ قلم می آورد (ص ۱۶۳-۱۶۴، قلمی نسخہ دار المصنفین)

**فوائد الفواد:** چہارم شنبہ بست و چہارم ماہ مبارک محرم سنہ اربع عشرہ و سبعمائیہ
سعادت پائبوس آمد آن روز جلد اول کہ ہم ازیں فوائد الفواد جمع کردہ شدہ است بحکم
فرمان پیش برد چون مطالعہ فرمود شرف استحسان ارزانی داشت و فرمود کہ نیکو نبشتہ ای
و درویشانہ بنشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای (ص ۱۹۸-۱۹۹، لاہور اڈیشن)

اب ہمارے ناظرین دونوں عبارتوں کو خود پڑھیں، اور فیصلہ کریں کہ دونوں بیانات
لفظاً و معناً ایک ہیں یا بالکل مختلف ہیں، ایک میں بات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہے، دوسرے میں
بہت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے، صرف دونوں میں "نیکو بنشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای"

کے لکھ جانے سے سرقہ کا الزام رکھ دینا کیا صحیح ہوگا؟ نام ہم نیکو کردہ ای اور نام ہم نیکو نہادۂ میں بھی فرق ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض مصنفوں نے خود افضل الفوائد سے ملفوظات لفظاً و معناً نقل کیے ہیں تو تعجب کرنے کی بات نہ ہونی چاہیئے مثلاً سیر الاولیا کے مولف امیر خسرو کے معاصر ہیں انھوں نے جو عبارتیں افضل الفوائد سے نقل کی ہیں ان کے کچھ نمونے یہاں پر درج کیے جاتے ہیں



| افضل الفوائد | سیر الاولیاء |
| --- | --- |
| دست بہ کف دست نمی زنند کہ آن بلہوی ماند بلکہ پشت دست بر کف دست بزنند یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است پس در منع مزامیر بطریق اولی بعد ازان فرمود کہ اگر یکے از مقامے بیفتد باری باید کہ در شرع افتد مبادا اگر از شرع بیرون افتد پس او را چہ ماند بعد ازاں فرمود کہ سماع مشایخ کبار شنیدہ اند آنکہ اہل ایں کار اند و کسیکہ صاحب ذوق است و درد دست بہ یک بیت کہ از گویندہ بشنود او را وقتی پیدا شود اگر چہ درمیان مزامیر باشد یا نباشد اما آنکہ در عالم ذوق خبر ندارد اگر پیش او گویندگان باشند و انہ ہر جنس مزامیر باشد چہ شود چوں او از اہل درد نیست پس معلوم شد کہ کار تعلق بہ درد دارد نہ مزامیر (قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۱۸۵) | پشت دست بر کف دست زند و کف دست بر کف دست نزند کہ آن بلہوی ماند تا این غایت از ملاہے و امثال پرہیز آمدہ است پس در سماع طریق اولے کہ ازیں بابت نباشد یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است پس در سماع مزامیر بطریق اولے منع است بعد ازان فرمود کہ سماع مشائخ شنیدہ اند و آنانکہ اہل ایں کار اند و آں کس صاحب درد و ذوق است کہ بہ یک بیت کہ از گویندہ شنود او را وقتے پیدا آید اگر مزامیر درمیان باشد یا نباشد اما آنکہ از عالم ذوق خبر ندارد اگر پیش او گویندگان باشند از ہر جنس، مزامیر باشد چہ سود دارد چوں از اہل درد نیست پس معلوم شد کہ کار تعلق بہ درد دارد نہ بہ مزامیر (سیر الاولیا ص ۵۲۲-۵۲۳) |
| دریں محل فرمود کہ وقتے خواجہ ابراہیم ادہم را سوال کردند کہ اسم اعظم یاد داری بگو کدام است جواب داد کہ معدہ را از لقمہ حرام پاک دار و دل را از محبت دنیا خالی کن بعد ازان کہ ہر اسمی کہ خوانی اسم اعظم است (ص ۱۸۶) | می فرمود از خواجہ ابراہیم سوال کردند کہ اسم اعظم یاد داری بگو جواب گفت معدہ را از لقمہ حرام پاک دار و دل از محبت دنیا دور کن بعدہ ہر اسمے کہ خدا را بدان بخوانی ہمان اسم اعظم است (ص ۲۶۸) |

اسی قسم کے اور نمونے ملیں گے اگر یہ خیال ہو کہ افضل الفوائد میں سیر الاولیا سے ایسی روایتیں لی گئی ہیں تو یہ صحیح نہیں کیونکہ سیر الاولیا میں فوائد الفواد اور تاریخ فیروز شاہی سے بلا تکلف عبارتیں لفظاً و معناً نقل کر لی گئی ہیں مثلاً

**فوائد الفواد**

فرمود کہ چوں من این سخن ازاں درویش شنیدم باخود مقرر کردم کہ دریں شہر نباشم، چند جائے دل من می شد کہ بردم، لختے، دل کردم کہ در قصبۂ پٹیالی بردم دراں ایام ترک آنجا بودہ است مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود عصمہ اللہ باز فرمود کہ یک دل کردم کہ در بسنالہ بردم کہ موضع منزہ است الغرض در بسنالہ رفتم سہ روز آنجا بودم دریں سہ روز ہیچ خانہ نیافتم نہ کرایہ و نہ گردی نہ بہای دریں سہ

**سیر الاولیاء**

می فرمود چوں من این سخن ازاں کہ درویش شنیدم باخود مقرر کردم کہ کہ دریں شہر نباشم چند جائے دل من شد کہ بردم لختے دل کردم کہ در قصبۂ پٹیالی بردم دراں آیام ترک آنجا بودہ است مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود یک دل کردم در بسنالہ بردم کہ موضع نزدیک است الغرض در بسنالہ ام سہ روز آنجا بودم ہیچ خانہ نیافتم نہ گردی نہ کرای دریں سہ روز مہمان یکی بودم چوں ازانجا بازگشتم این اندیشہ در خاطر می بود تا وقتے جانب حوض رانی بودم در باغے کہ آن را باغ جسرت گویند باخدائے



روز ہر روز مہمان یکی بودم چوں ازانجا بازگشتم این اندیشہ در خاطر می بود تا وقتی جانب حوض رانی بودم در باغی کہ آن را باغ جسرت گویند باخدائے عزوجل مناجات کردم وقتے خوش بود گفتم کہ خداوندا مرا می باید کہ ازیں شہر بردم وجاے باختیار خود نمی خواہم آنجا کہ خواست تو باشد آنجا باشم! دریں میان آوازہ غیاث پور آمد من ہیچ وقت غیاث پور را ندیدہ بودم ونمی دانستم کہ غیاث پور کجاست چوں این آوازشنیدم بر دوستی رفتم ان دوست را نقیبی بود نیشاپوری چوں در خانۂ او رفتم مرا گفتند در غیاث پور رفتہ است من

مناجات کردم وقتے خوش بود گفتم کہ خداوندا! مرا می باید کہ ازیں شہر بردم وجائے باختیار خود نمی خواہم آنجا کہ خواست تو باشد آنجا باشم دریں میاں آواز آمد کہ غیاث پور من ہیچ وقتے غیاث پور را ندیدہ بودم ونمی دانستم کہ غیاث پور کجاست چوں ایں آواز شنیدم بر دوستے رفتم ان دوست را نقیبے بود نیشاپوری چوں در خانہ او رفتم مرا گفتند کہ در غیاث پور رفتہ است من با دل خود گفتم کہ ایں آن غیاث پور است الغرض باو شدہ در غیاث پور آمدم آن روز آن مقام ہم چنیں آبادان نبود موضعے مجہول بود ساعدم سکونت کردم تا آنگاہ کہ کیقباد کہ در کیلو کھری ساکن شد دران

باد دل خود گفتم این همان غیاث پور
است الغرض در غیاث پور
آمدم آن روز این مقام
چنان آبادان بنوده است
موضعی مجهول بوده و خلق
اندک بیامدم و سکونت
کردم تا آنگاه که کیقباد در
کیلوکری ساکن شد ده آن
عهد خلق این جا انبوه شد از
ملوک و امرا و غیر آن آمده شد
خلق بسیار شد من با خود گفتم که
ازین جا هم باید رفت درین
اندیشه بودم تا بزرگی که استاد
من بود در شهر وفات کرد من
باد دل خود راست گرفتم نه فردا که
از وفات او سوم خواهد بود من
بر زیارت او بردم دهم شهر در باشم
این نوبت بر خود مقرر کردم همان روز
نماز دیگر جوانی درآمد صاحب حسنی اما

این جا خلق انبوه شد از ملوک و امرا
و غیر آن آمده شد خلق و مزاحمت
ایشان بسیار شد با خود گفتم ازین جا
باید رفت درین اندیشه بودم همان
روز نماز دیگر جوانی درآمد صاحب
حسنی اما نزار گشته والله اعلم از
مردان غیب بود یا که بود الغرض چون
بیامد اول سخن با من این گفت
آن روز که مه شدی نمی دانستی
کانگشت نمای عالمی خواهی شد
امروز که زلفت دل خلقی بربود
در گوشه نشستنت نمی دارد سود
(ص ۱۱۱ - ۱۱۰)



نزار گشته والله اعلم از مردان غیب بود بلکه
بود الغرض چو بیامد اول سخن که با من گفت این
آن روز که مه شدی نمی دانستی
کانگشت نمای عالمی خواهی شد
امروز که زلفت دل خلقی بربود
در گوشه نشستنت نمی دارد سود (ص ۲۴۳ - ۲۴۲)

## تاریخ فیروزشاهی

الفضل والکمال والفنون
والبلاغ صوفی مستقیم الحال
بود و بیشتری عمر او در
صیام و قیام و تعبد و قرآن
خوانی گذشته است و به طاعت
متعبد به و لانه بیگانه شده
بود و دایم روزه داشتی
و از مریدان خاصه شیخ بود
و آنچنان مریدی معتقد
من دیگری را ندیده ام
و از عشق و محبت نصیبی تمام
داشت و صاحب سماع

## سیر الاولیاء

الفضل والکمال والفنون والبلاغ صوفی
مستقیم الحال بود و بیشتر عمر او در
صیام و قیام و تعبد و تلاوت گذشته
است و از مریدان خاصه حضرت
المشائخ شیخ الشیوخ العالم سید نظام الحق
والدین محمد احمد بداونی البخاری
الچشتی قدس الله سره العزیز بود
و آن چنان مرید و معتقد من دیگرے
را ندیده ام و از عشق و محبت
نصیبی تمام داشت و صاحب سماع
و وجد و صاحب حال بود
و در علم موسیقی کمال داشت و هرچه

وصاحب وجد و صاحب حال بود و در علم موسیقی گفتن و ساختن کمالی داشت و ہر چہ نسبت بہ طبع لطیف و موزون گفتند باری تعالیٰ او را در آں ہنر سر آمدہ گرداینده بود و وجودے عدیم المثال آفریده و در قرون متاخر از نوادر اعصار پیدا آورده (ص ۳۵۹)

نسبت طبع لطیف و موزون کند باری تعالیٰ او را در ان ہنر سر آمد گرداینده بود و وجودے عدیم المثال آفریده و در قرون متاخر از نوادر اعصار پیدا آورده (ص ۵۰۰)

مذکورۂ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ سیر الاولیا کے مولف نے جس طرح فوائد الفواد اور تاریخ فیروز شاہی سے عبارتیں لی ہیں اسی طرح افضل الفوائد سے بھی لی ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پیش نظر یہ مجموعۂ ملفوظات بھی رہا اور وہ اس کو مستند سمجھے۔ (باقی)

---

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

## غالب مدح و قدح کی روشنی میں

(حصہ دوم)

جس میں مرزا غالب کی شاعری کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، سلسلۂ غالبیات میں ایک مفید اضافہ،

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن



# جمالی
# لودی اور مغل دور کا شاعر

(۲)

از ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم، مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

**مثنوی مہر و ماہ** اس مثنوی کا صرف ایک مخطوطہ دستیاب ہے، جو پنجاب یونیورسٹی میں ہے[1]، یہ ۱۱۸ اوراق پر مشتمل ہے، اس کے پہلے تین ورق غائب ہیں، علاوہ ازیں، شعر:-

چوں مہر مہر در زد ذرہ در خاک | بجاں سرگشتہ گرد سوے افلاک

سے شعر:-

چو مہرش دید یکسو گشت از ماہ | کہ آں سیارہ را بر مہ دیدہ راہ[2]

تک (از ورق ۷۰ الف تا ۸۰ ب) مکرر لکھے ہوئے ہیں، اس طرح اصل کتاب کی ضخامت ۱۱۳ ورق رہجاتی ہے، یہ شاہ بدخشاں کے لڑکے ماہ اور مینا کے حکمراں کی لڑکی مہر کی داستان ہے، ماہ خواب میں مہر کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوجاتا ہے[3]، عشق میں خورد و نوش ترک اور نیند غائب ہوجاتی ہے[4]، جب پتہ چلتا ہے کہ یہ عشق کا کرشمہ ہے تو اسے ملک مینا جانے کی اجازت ملتی ہے، اور وزیر کا لڑکا عطارد[5]، اور ایک بڑا لشکر اس کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، راستے میں کشتیاں طوفان کی نذر ہو جاتی ہیں، لشکر تتر بتر ہو جاتا ہے[6]، ماہ و عطارد بھی بچھڑ جاتے ہیں، بالآخر ماہ کوہ قاف پہونچ جاتا ہے، جہاں طرابلس کے قلعہ میں اس کی

---

[1] مجموعہ شیرانی مخطوطہ نمبر پی آئی چار ۶۳، اور کیٹلاگ نمبر ۵۲ ص ۱۹ [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۷۱ الف [3] ایضاً ورق ۲۲ الف تا ۲۲ ب [4] مثنوی مہر و ماہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ورق ۲۳ الف [5] ایضاً ورق ۲۹ الف تا ۳۱ الف [6] ایضاً ورق ۵۱ الف تا ۵۳ ب

ملاقات عطارد سے ہوتی ہے، ماہ قلعہ کے حاکم اہرمن کو قتل کر دیتا ہے اور قلعہ پر قبضہ کر لیتا ہے جہاں اسے ایک بڑا خزانہ ہاتھ لگتا ہے، وہاں اس کی ملاقات بہرام کے وباسوس سعد اکبر سے ہوتی ہے جو اسی کی تلاش میں نکلا تھا، طرابلس کے قلعہ کی فتح ماہ کی بہادری کا سکہ جما دیتی ہے، وہ سعد اکبر کے سامنے اپنے عشق کا حال بیان کرتا ہے، سعد اکبر مینا واپس پہنچ کر مہر کو پورا حال سناتا ہے، ادھر مہر بھی اسی طرح خواب میں ماہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اپنی سہیلی ناہید کے مشورے سے مہر، سعد اکبر کو اپنا راز دار بنا لیتی ہے سعد اکبر، شہاب کو پیغام دے کر ماہ کے پاس بھیجتا ہے، وہ عاشق و معشوق کی ملاقات کا انتظام ایک باغ میں کرتا ہے اسی دوران روم کا بادشاہ اسد بہرام کے پاس مہر سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے اور انکار کی صورت میں حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے، بہرام رشتہ نامنظور کر دیتا ہے اور اسد فوج لے کر حملہ آور ہوتا ہے، ماہ، بہرام کی مدد کو پہنچ جاتا ہے اور اسد کو شکست دے کر اسے قید کر لیتا[1] ہے بعد میں اسد اپنی وفاداری کا یقین دلا کر رہائی پاتا ہے، بہرام بطور انعام مہر کی شادی ماہ سے کر دیتا ہے، ماہ کے اعزاز میں دعوت دی جاتی ہے پھر نو بیاہتا جوڑا طرابلس کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے، وہاں موسم بہار کا جشن منایا جاتا ہے، جشن کے دوران ہی خضر ماہ کے باپ کی موت کی خبر لے کر آتا ہے،[2] ماہ کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہوتا ہے اور وہ مر جاتا ہے،[3] بیوہ مہر، ماہ کی قبر پر ماتم کرتی ہے اور فرط غم سے مر جاتی ہے، قبر پھٹ کر مہر کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، اس طرح عاشق و معشوق پھر یکجا ہو جاتے ہیں،[4] عطارد، ناہید، سعد اکبر، شہاب اور بہت سے دوسرے ساتھی بھی اسی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں،[5] اس جگہ کا نام روضۃ الاحباب پڑ جاتا ہے[6] اس طرح یہ داستان اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۰۸ ب تا ۱۱۱ ب [2] ایضاً ورق ۱۱۲ الف سے

گذشت از منزل این دہر فانی، قدم زد در سرائے جاودانی۔



تصنیف کا سبب اور زمانہ | یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ جمالی نے حرمین شریفین اور اسلامی ممالک کا طویل اور صبر آزما سفر کیا تھا غریب الوطنی میں انہیں وطن اور ہم وطنوں کی یاد ستایا کرتی تھی، اس سے وہ مغموم رہا کرتے تھے اہل تبریز نے جمالی کا غم محسوس کیا، اور مشورہ دیا کہ عصار تبریزی کی مثنوی "مہر و مشتری" کے طرز پر وہ ایک مثنوی نظم کر ڈالیں، اس سے ان کا دھیان بٹا رہے گا، وطن اور ہم وطنوں کا غم غلط ہو سکے گا، جمالی خود کہتے ہیں[1]

| | |
|---|---|
| خداونداں کہ در تبریز بودند | مرا روئے خداوندی نمودند |
| براہ دوستی و در روئے یاری | بشرط ہمدمی و غمگساری |
| شدند این خستہ دل را در شب و روز | بہ تنہائی چراغ خاطر افروز |
| ز روئے نخل بندی اہل تبریز | ز نخل دوستی گشتہ رطب ریز |
| بگفتند اے چراغ عشق بازی | ز تو پروانہ جاں در گدازی |
| ترا راہ حجاز از اشتیاق است | سزاوارے تو ایں راہ عراق است |
| نشیں در پردہ ہائے دیدۂ ما | کہ جائے مردم بینا است ایں جا |
| نوائے خوش براہ عشق بنواز | کہ گردد پردۂ عشاق را ساز |
| کتابے ہست مہر و مشتری نام[2] | بہ شہرت ہمچو مہر و مشتری عام |
| ز تصنیف سپہر فضل عصار | کہ او استاد استاد است در کار |
| تو ہم در فکر مہر و مشتری باش | بمہر دل مرا او را مشتری باش |

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۰ پر) [3] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۵ الف سے یہاں دم تربت دلدار شد شق و فتاد آں نازنین در تربت الحق۔[4] [5] ایضاً ورق ۱۱۵ ب سے کنوں آں روضہ را آناں کہ دانند، بعالم روضۃ الاحباب خوانند [6]

[1] ایضاً ورق ۱۳ ب تا ۱۴ الف [2] دیکھئے مدرسہ عالیہ ڈھاکہ مخطوطہ نمبر [illegible]

زخاموشی دھن بکشاد برخیز — در معنی بگوش عاشقاں ریز

جمالی کو ان کا مشورہ پسند آیا اور انھوں نے مثنوی کی ابتدا کردی۔[1]

در گنج معانی باز کردم — حدیث مہر و ماہ آغاز کردم

جمالی دعوی کرتے ہیں کہ اس فن میں وہ عصار سے آگے نکل گئے ہیں۔[2]

دل غواصم از بحر معانی — بدست آورد در کامرانی

ملک گنجینہ بر طبعم کشادہ — فلک بر پائے فکرم بوسہ دادہ

باسرار نہانی یاتم بار — سعادت ہم نشیں و دولتم یار

دلم اسرار نقش لوح محفوظ — بہم رازان عالم کردہ ملفوظ

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۸، ب [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۸ الف

لیکن عصار کی مثنوی انداز بیان، شاعرانہ لطافت اور پلاٹ کے اعتبار سے جمالی کی مثنوی سے کہیں بہتر ہے، عصار کا انداز بیان زیادہ فنکارانہ ہے، اہل زبان ہونے کی وجہ سے اسے زبان پر زیادہ قدرت حاصل تھی، علاوہ ازیں عصار کی زبان پر ایرانی رنگ غالب ہے جو جمالی کو میسر نہیں، جمالی کا یہ دعوی کہ ان کی مثنوی کسی دوسری کہانی کا چربہ نہیں، غلط ہے، مثنوی مہر و مشتری ان کے سامنے تھی اور اسی کو مشعل راہ بنا کر انھوں نے اپنی مثنوی کو نظم کیا ہے، جمالی ایک جگہ خود کہتے ہیں کہ انھوں نے "مہر و مشتری" کو نئی زندگی عطا کی ہے، جمالی کی مثنوی کی ابتدا خوابوں کی سرزمین سے ہوتی ہے اس کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہو جاتے ہیں، ہیرو اپنے باپ کی موت کی المناک خبر سن کر مرجاتا ہے ساتھ ہی ہیروئن اور دوسرے کردار بھی مرجاتے ہیں، عصار "مقابلتہ" اس کمزوری سے پاک ہے اس کے کردار انسانوں کی دنیا کے کردار ہیں، مہر و مشتری کا عشق ہر چند کہ غیر فطری نظر آتا ہے، مگر اس کے زمانہ میں ایسی محبت عام تھی۔ "مہر و مشتری" کی کہانی کا خلاصہ درج ذیل ہے،



چو عیسی از دم جاں بخش اشعار — حیات تازہ بخشیدم بہ عصار

بجان مہر و مہ را مشتری گشت — ز مہر و مشتری جانش بری گشت

---

(الف صفحہ ۱۹۳) مہر ایران کے بادشاہ شاہ پور کا لڑکا ہے اور مشتری اس کے وزیر کا لڑکا ہے، دونوں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں، بہرام اور بدر ان کے نوکر ہیں، مہر و مشتری میں گہری محبت ہے، حاسد بہرام اس محبت کو غیر فطری سمجھتا ہے اور استاد کے ذریعہ بادشاہ تک شکایت پہونچاتا ہے، بادشاہ کے حکم سے دونوں جدا کردیئے جاتے ہیں، مہر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حجرہ میں پڑھا کرے، مشتری عالم فراق میں بیمار پڑجاتا ہے، وہ بدر کے ذریعہ مہر کے پاس خط بھیجتا ہے لیکن خط پکڑا جاتا ہے اور مشتری اور بدر جلا وطن کردیئے جاتے ہیں، مہر کو قید کرلیا جاتا ہے، قید سے آزاد ہو کر مہر اپنے ساتھیوں اسد، جوہر اور صبا کو ساتھ لے کر مشتری کی تلاش میں ہندوستان کی طرف چل پڑتا ہے راستہ میں طوفان آگھیرتا ہے، جہاز تباہ ہوجاتا ہے اور مہر ایک جزیرہ میں پہونچ جاتا ہے، وہاں سے وہ خوارزم کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، راستہ میں وہ شیر کا شکار کرتا ہے اور ڈاکوؤں کو لوٹ لیتا ہے، خوارزم پہنچ کر وہ شاہ کیوان کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کرتا ہے، دوسرے دن اس کی شرافت و نجابت کا امتحان لینے کے لیے اسے محل میں بلایا جاتا ہے، وہ دربار کے آداب بجالاتا ہے اور ہر امتحان میں کامیاب ہوتا ہے، اسے محل میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے، شہزادی ناہید اس پر فریفتہ ہوجاتی ہے، اور عشق کا پیغام بھیجتی ہے، مہر اسے قبول کرلیتا ہے، شہزادی اپنی محبت کا حال اپنی ماں سے کہتی ہے اور ماں کے ذریعہ یہ خبر بادشاہ تک پہونچتی ہے، بادشاہ دونوں کا رشتہ منظور کرلیتا ہے، سمرقند کا حکمراں قراخاں بھی شہزادی سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے جو رد کردیا جاتا ہے، غصہ میں قراخان فارس پر حملہ کردیتا ہے، مہر بادشاہ کی مدد کو پہونچتا ہے اور قراخاں کو شکست دے کر اسے گرفتار کرلیتا ہے، بعد میں مہر کی سفارش پر وہ رہا کردیا جاتا ہے، بادشاہ مہر کے اس کارنامے کو سراہتا

اس مثنوی کے ایک باب کا عنوان "سبب نظم مثنوی" اسمیں جالی نے وجہ تصنیف بیان کی ہے۔ اسمیں دہلی، اکبر پوری شیخ سماءالدین اور عزیزوں کا ذکر ملتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسوقت لکھی گئی ہے جب وہ اسلامی ممالک کے سفر پر تھا، کتاب کے اختتام پر مندرجۂ ذیل تاریخی شعر سے کتاب کی تصنیف کی صحیح تاریخ کا پتہ چلتا ہے،

---

اور اسے ناہید کی شادی کا پیغام دیتا ہے، جشن منایا جاتا ہے، مہر جشن سے کھسک کر تنہائی میں چلا جاتا ہے، جہاں ناہید اس کا استقبال کرتی ہے، صبح تک دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، یہاں ناہید کی محبت اور مشتری کی دوستی میں کشاکش ہوتی ہے، ادھر مہر کا باپ بہرام کو شہزادے کی تلاش میں بھیجتا ہے، عالم جلاوطنی میں مشتری اور بدر اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں، بہرام دونوں کو سنگ دلانہ سزا دیتا ہے، بدر کسی طرح بھاگ نکلتا ہے اور خوارزم پہونچ جاتا ہے، جہاں اس کی ملاقات مہر سے ہوتی ہے، بہرام اور مشتری محل میں بلائے جاتے ہیں، اس طرح دونوں دوست پھر مل جاتے ہیں، مہر اور ناہید کی شادی ہو جاتی ہے اور جشن منایا جاتا ہے، ایک ماہ بعد مہر، ناہید کے توسط سے بادشاہ سے اپنے ملک جانے کی اجازت لیتا ہے اور وہ سب استخر واپس لوٹ آتے ہیں، وہاں بدحواس بادشاہ اور ملکہ ان کا استقبال کرتے ہیں، شاہ بوڑھا مہر کو ایران کی بادشاہت عطا کرتا ہے اور مشتری اپنے مرحوم باپ کی جگہ اسکا وزیر بن جاتا ہے، پانچ چھ سال کے بعد مہر ایک خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتا ہے، مشتری کو بھی وہی مرض لاحق ہوتا ہے اور دونوں ایک ہی وقت موت کے آغوش میں پہنچ جاتے ہیں، عالم نزع میں بھی مشتری کے لبوں پر مہر ہی کا نام ہوتا ہے، دونوں کا تابوت قبرستان کی طرف لے جایا جاتا ہے، راستہ میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ مشتری کا تابوت انہیں مہر کے تابوت کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے، مشتری کے تابوت سے ایک پرندہ اڑ کر مہر کے تابوت میں داخل ہو جاتا ہے، اس طرح دونوں دوست یکجا ہوتے ہیں (ورق ۱۹۹ ب تا ۲۰۰ الف) مہر کے تابوت کی روانگی کے بعد ناہید مرجاتی ہے اور ایک چار سالہ بچہ بطور ولی عہد چھوڑ جاتی ہے، مہر اور مشتری کے دوست بھی مرجاتے ہیں، ورق ۲۰۰، ۲۰۲ الف [1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۲ ب تا ۱۵ الف



جو تاریخش بجوی اے خدا بین      نگر در "مہر و ماہ" مرشد دین
۹۰۵ھ

اغلباً یہ مثنوی سکندر لودی کے نام معنون ہے[1]

**پلاٹ کی اصلیت**

ORIGINALITY جالی کا دعویٰ ہے کہ کہانی کا پلاٹ اور تخیل (Originality) ہے وہ کہتا ہے کہ ہر چند کہ فردوسی، نظامی، خسرو اور جامی کی تصنیفوں کے نمونے موجود ہیں، لیکن اس نے ان میں سے کسی کی پیروی نہیں کی، وہ فخر کرتا ہے کہ اس کی مثنوی کی کہانی اسکا اپنا اختراع ہے، مسروقہ نہیں،

چو بد خوانش رسیدم من از آں پس      نشد میلِ دلم بر خوردۂ کس
بحمد اللہ مرا ہم توشہ بود      اگر خرمن نہ بود خوشہ بود
ز صد خرمن نگو یک شاخ ارزن      کہ دزدی را بنا شد اندر و ظن

پھر بھی وہ توارد کے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیتا، توارد کو محض اتفاقیہ قرار دیتا ہے اور اس کی ذمہ داری سے خود کو بری سمجھتا ہے،

توارد گر فتد عیبے نہ باشد      کہ چون واقف عیبے نہ باشد
بسا فرزندگان زاید بیک شکل      بسا یک لذت آید مختلف اکل

---

(بقیہ حاشیہ ص، ۱۹۴) [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۲ ب تا ۱۵ الف [3] ایضاً ورق ۱۱۷، ب

اگرچہ بودم از دہلی بسے دور      دلم می یافت از حب الوطن نور

[4] ایضاً ورق ۱۱۷ ب

سکندر را حیات جاوداں باد      کہ یاد او مرا آب خضر داد
بیاد بادشاہ خویش ہر دم      دل محزون من می گشت خرم

اس زمانہ کی روش کے مطابق مثنوی کی ابتدا، حمد[۱]، مناجات[۲]، نعت[۳]، معراج[۴]
مدح شیخ سماء الدین[۵] اور شان نفس امارۂ نابکار و نصیحت بہ ابنائے روزگار[۶] "سبب نظم[۷]"
اور حکایت[۸] در تکلف شعر و سلاست سخن" سے ہوتی ہے، پھر اصل کہانی ہے اور آخر میں
"تاریخی شعر" ہے جس سے تصنیف کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے[۹]

جالی مثنوی میں رومانی فضا پیدا کرتا ہے، ہیرو اور ہیروین کو ایک دوسرے
کے قریب لاتا ہے، اور ناقابل عبور رکاوٹوں کو طے کرا کے دونوں کو یکجا کر دیتا
ہے، محض اس سے وہ مطمئن نہیں ہوتا اور ٹھیک اس وقت جب خوشیاں اپنے شباب
پر ہوتی ہیں کہانی کو المیہ بنا دیتا ہے، پہلے ہیرو مرتا ہے پھر ہیروین اور اس کے
بعد دوسرے کردار بھی مرجاتے ہیں، اور اس طرح وہ دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہو کر
عالم جاودانی میں یکجا ہو جاتے ہیں،

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵) [۸] ایضاً ورق ۱۰ الف

اگرچہ روئے ظاہر دور م ازوے — بباطن ہر نفس پر نورم ازوے

[۹] ایضاً ورق ۱۰ ب سہ

ز خویشان و عزیزاں دل کشیدم — غریبی را صلاح خویش دیدم

ورق ۱۳ ب سہ

فراق ہمنشیناں قدیمم — جگر می سوخت چوں نار جحیم

[۱۰] ایضاً ورق ۱۰۸ ب [۱۱] ایضاً ورق ۱۱۷ ب تا ۱۱۸ الف سہ

سکندر را حیات جاوداں باد — کہ یادا در مر آب خضر داد
بیا و بادشاہ خویش ہر دم — دل خود را من می گشت خرم
خداوندا چنیں شاہ جواں بخت — بباد تا ابد پائندہ بر تخت

[۱۲] ایضاً ورق ۱۳ ب [۱۳] ایضاً ورق ۱۳ ب



مثنوی میں روحانیت اور ابدیت کا رنگ بھرنے کے لیے جالی نے کرداروں
کے نام ستاروں اور سیاروں کے نام پر رکھا ہے جیسے مہر، ماہ، عطارد، ناہید،
سعد اکبر، شہاب وغیرہ "صبا" کو پیغامبر اور ظلمت ناامیدی میں "خضر" کو رہبر بنایا ہے
ایک کردار (ویلین) کا نام اہرمن رکھا ہے جو برائیوں کا پیکر سمجھا جاتا ہے، کہانی کا
مقام افسانوی سرزمین کوہ قاف ہے جو کہانی کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے کہانی
سسپنس سے پر ہے،

اس مثنوی کے لیے جالی نے شش رکنی بحر ہزج محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)
کا انتخاب کیا ہے جو رومانی مثنویوں کے لیے بہت موزوں ہے، نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں"
جامی کی "شیریں و خسرو" اور "یوسف و زلیخا" اسی بحر میں ہے،

انداز بیان شستہ اور سلیس ہے، محاوروں کا استعمال بھی خوب خوب کیا گیا
ہے الفاظ کی بندش قابل داد ہے، لیکن نظامی کے یہاں جو جوش ملتا ہے وہ اس مثنوی
میں نہیں شہزادی مہر کا سراپا (جو ماہ خواب میں دیکھتا ہے) مسحورکن ہے، اس سراپا میں
جالی نے نئی نئی تشبیہیں اور استعارے نہایت خوبصورت انداز میں استعمال کیے ہیں[۱]

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵) [۱] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱ الف تا ۵ الف [۲] ایضاً ورق ۵ ب تا ۶ ب [۳] ایضاً ورق
۶ ب تا ۷ ب [۴] ایضاً ورق ۷ ب تا ۹ الف [۵] ایضاً ۹ الف تا ۱۰ الف [۶] ایضاً ۱۰
الف تا ۱۲ ب [۷] ایضاً ۱۲ ب تا ۱۵ الف [۸] ایضاً ۱۵ الف تا ۱۶ الف [۹] ایضاً ۱۱۸ ب
(حاشیہ ص ہذا) [۱] ایضاً ۲۰ ب تا ۲۱ الف۔ عصار کی مثنوی مہر و مشتری
(مدرسہ عالیہ مخطوطہ نمبر ۱/۱۱ کے باب رفتن مہر بجام (ورق ۱۱۳ ب تا ۱۱۴ ب)
اور نشستن مہر با ناہید (ورق ۱۸۸ الف تا ۱۹۰ ب) سے مقابلہ کر کے دیکھئے،

ہزاراں ماہ و مہر گرد آں تخت
بدو بنشستہ یک حور جواں بخت

نہ حورے بلکہ خورشیدے پری رنگ
کہ از عکس رخش گوہر شود سنگ

فلک برگشتۂ ماہِ جمالش
فلک آشفتۂ زلفِ جوادش

دہانِ تنگ از روے تبسم
بدل جوئی گہے پیدا گہے گم

گہر در درجِ لعلش وقت خندہ
ہوا در برگِ گل شبنم فگندہ

زبانش در دہن با در دنداں
تگرگ و سوسن اندر غنچہ پنہاں

لبش از شہد و از شکر سرشتہ
زبانِ شکر و شہدش فرشتہ

بت خورشید عالمتاب دلخواہ
چو خورشیدے کہ آمد رہزنِ ماہ

دہانش پستہ، خنداں شکستہ
صدف را گوہر دنداں شکستہ

لبش جانِ خضر را آب دادہ
رخش خورشید و مہ را تاب دادہ

گگیسو کافر و از رخ مسلماں
بہ نرگس خوں خورد وز لب دہد جاں

یکے خالش بزیرِ چشم جادو
فتادہ نافۂ از ناف آہو

بخوبی چوں خم ابروے خود طاق
غمش پیوستہ جفتِ جانِ عشاق

دو زلفش تا میانش پیچ در پیچ
دہانش چوں میانش ہیچ در ہیچ

بہ شوخی غمزہ را خونخوار کردہ
جہاں از غمزہ در خونخوار کردہ

گلش را جعد سنبل بر کرانہ
ہمش را چاہِ بابل در میانہ

بزیرِ بروے او چشم پر خواب
دو ہندو سر نہادہ زیرِ محراب

جمالی عشق کے اسرار و رموز سے خوب واقف معلوم ہوتا ہے، باغ میں ماہ و مہر کی ملاقات ہوتی ہے تو ماہ عشق کا اظہار کرتا ہے اور ہجر کی کلفتیں بیان



کرتا ہے اسے جمالی نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے[1]

نمی دانی کہ من ماہم تو ئی مہر
مرا روشن نہ گردد بے رخت چہر

چو ذرہ مہرے از خورشید یابد
شود سرگشتہ سوے او شتابد

منم ذرہ تو ئی مہرِ جہاں تاب
ز مہر خود دل ایں ذرہ دریاب

دلم از محنتِ غمہاے ماضی
بہ بہشت عرض دادن نیست راضی

در ایام وفا ذکرِ جفا را
نمودن روے می پوشد وفا را

ماہ کی اچانک موت سے مہر کو سخت صدمہ پہونچتا ہے، وہ زندگی کی راحتیں بھول جاتی ہے، ماہ کی یاد میں روتی ہے بلبلاتی ہے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے، ماہ کی قبر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے،

مہی چوں تربت دلدار خود دید
بصد زاری زباں بکشاد و نالید

کہ در خاک اے قمر رخسار چونی
تو ماہی در میانِ غار چونی

برے از بار گل آزردہ گشتے
تنے کز پیرہن افسردہ گشتے

کنوں در زیر چندیں بار چونست
نمی دانم دریں آزار چونست

عذارت تازگی کاں بود چو روح
شدے از سایۂ زلف تو مجروح

چنانت ایں زماں افتادہ در گل
ز جورِ آسماں مجروح چوں دل

قبر پھٹ کر مہر کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس طرح عاشق و معشوق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جاتے ہیں[2][3]

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۰۷ الف تا ۱۰۷ ب [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۴ الف تا ۱۱۵ الف

[3] ایضاً ۱۱۵ الف

ہماں دم تربتِ دلدار شد شق — فتادن نازنیں در تربت احق

بیک معدن دو گوہر گشت پنہاں — یکے بود آں دو تن را چو ہر جاں

چو بود آں ہر دو تن را جاں زیک نور — دل ایشاں شد از دواں دوئی دور[1]

ماہ و مہر کے احباب بھی ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، شاعر دنیا کی ناپائیداری کا ذکر کرتا ہے اور پند و نصائح کا دفتر کھل جاتا ہے، یہ دنیا عارضی ہے اور موت یقینی ہے یہاں آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا ہے[2]

گذشتند از جہاں یاراں یکدل — بفردوسِ بریں کردند منزل

ہمیں رسم است گوئی اندریں دہر — یکے ساکن یکے در سرعت سر

یکے زیں خانہ بیروں می نہد پائے — بیا بد دیگرے در وے کند جائے

دریں خانہ قرارے نیست کس را — کہ ایں شکر ہمی راند مگس را

جالی نے انسانی جذبات کی تصویر کشی میں بڑی ہنرمندی دکھائی ہے، ماہ کی گرتی ہوئی صحت اور بدلی ہوئی حالت پر باپ کے بے غرضانہ جذبات کی تصویر کشی قابلِ داد ہے، بطور مثال دو شعر دیکھئے[3]

چکیدش خون دل از چشم پر غم — ہمی نالید و می پرسید ہر دم

کہ اے جان پدر حال تو چون است — کہ از بہر تو چشم غرق خون است

جالی کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے انہوں نے مختلف واقعات، مقامات اور حسنِ قدرت کی منظر نگاری بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے طرابلس کے باغ کا ایک منظر نامہ ہم چند شعر بطور نمونہ حاضر ہیں[4]

۱۔ عصار کی مثنوی مہر و مشتری (ورق ۱۹۹ ب تا ۲۰۰ الف) کا باب "در وفات مہر و مشتری" و نیز بھی دیکھئے ۲۔ مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۵ ب ۳۔ ایضاً ۱۲۲ الف ۴۔ ایضاً ۱۲۴ ب



دمیدہ بر لبِ جو سبزۂ خوش — چو خط بر عارضِ خوباں مہوش

شگفتہ لالہ و گل اندر آن باغ — نہادہ بر دلِ باغ جناں داغ

عمارتش رسیدہ کاخ در کاخ — گلستانش کشیدہ شاخ در شاخ

ستادہ در چمن ہر سرو آزاد — کہ صد طوبیش خط بندگی داد

صنوبر در قیام احترامش — بنفشہ در سجود احترامش

زلالش دادہ آبِ خضر را نم — نسیمش روح بخش ابن مریم

اسد شاہ اور بہرام شاہ کی جنگ میں سپاہیوں کی بہادری کے کارنامے اور میدانِ جنگ کا بیان بہت واضح ہے، قاری جنگ کی پوری کیفیت محسوس کرتا ہے[1]

دو لشکر گشتہ چو طوفاں خروشاں — دو بحر افتادہ باہم سینہ جوشاں

زجا جنبید گوئی مرکز خاک — غبارش شد حجابِ روئے افلاک

سمنداں را عناں اندر عناں شد — جواناں را سناں اندر سناں شد

ترنم ساز شد آواز ناوک — بہ بستان وغا شد چکاوک

ز شمشیر و خدنگ شہسواراں — پدید آمد ہمیچا برق و باراں

ز آواز دہل و زگرد لشکر — زمین و آسماں ہم کور و ہم کر

شرارِ نعل اسپان زمین تاب — درخشاں در ہوا چوں کرمِ شبتاب

ز گرمی سینۂ مرداں در آتش — از آں گرمی غریباں از دیارش

ز پہلوئے یلاں شمشیر پرخوں — از آں آتش نہ گرمی گشت گلگوں

عقاب اندر کمندِ پہلواناں — کشاکش کردہ چوں زلفِ جواناں

۱۔ مثنوی مہر و ماہ ورق ۲۵ ب تا ۲۶ الف

| | |
|---|---|
| نہال نیزہ از خون یلانے | چو شاخ ارغواں در گل فشانے[1] |

مثنوی کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کرنے والے دل کے احساسات و جذبات سے جالی خوب واقف ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار واضح کرتے ہیں کہ سکندر لودی اور شیخ سماء الدین کے علاوہ بھی اس کے دوسرے دوست تھے جنھیں وہ بہت محبوب رکھتا تھا[2]

| | |
|---|---|
| فراقِ ہم نشینانِ قدیمم | جگر می سوخت چوں نارِ جحیم |
| بیادِ روئے ہر مشکیں کلالہ | مدام از نرگسم می ریخت لالہ |
| شبانروزے بیادِ روئے ایشاں | چو زلف لالہ رخساراں پریشاں |

جالی کے لیے محبوب کی جدائی ناقابل برداشت ہوتی ہے اسی خیال سے اس نے عمر میں کسی کو دوست نہیں بنایا[3]

| | |
|---|---|
| دلا بر خود نہم از بیم جدائی | نمی زد دم ز روئے آشنائی |
| مبادا با کسے پیوند گیرد | کہ بعد از وصل در ہجراں بمیرد |

مثنوی کے اختتام پر جالی کہتا ہے کہ اپنے مثنوی میں اپنا "درد دل" بیان کیا ہے، مہر و ماہ کی کہانی تو ایک بہانہ ہے[4]

| | |
|---|---|
| نہادم مہر و مہ را قصہ در پیش | در آنجا ریختم دردِ دلِ خویش |
| بروں دادم غمِ دل در فسانہ | حدیثِ مہر و ماہم شد بہانہ |
| سوادِ نامہ خود افسانۂ ماست | کہ ایں درد از دلِ دیوانۂ ماست |

---

[1] دیکھیے عصار کی مثنوی ورق ۱۵۰ الف تا ۱۶۳ ب باب حرب کردن کیواں با تراخان [2] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۳ ب [3] ایضاً ۱۳ ب [4] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۱۸ الف ب



جالی اس مثنوی کو بہت بلند تر سمجھتا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ مثنوی کسی کا چربہ نہیں، چار شہرہ آفاق مثنوی نگاروں فردوسی، نظامی، خسرو اور جامی یا کسی دوسرے مثنوی نگار شعرا[1] سے اس نے کچھ مستعار نہیں لیا ہے۔ اس نے اپنی راہ خود نکالی ہے۔ دوسرے کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنا اسے پسند نہیں[2]۔ جالی سمجھتا ہے کہ یہ مثنوی اتنی اعلیٰ ہے کہ دوسرے اس سے حسد کرنے لگیں گے[3]

| | |
|---|---|
| دُرِ من گرچہ رخشاں ہمچو بدر است | بہ چشمِ کور گوہر را چہ قدر است |
| حدیثِ من ز روئے مہر و ماہ است | رخِ حاسد از آں چوں شب سیاہ است |
| رخِ انشائے من چوں ماہ و خورشید | منور باد در آفاق جاوید |

جالی کہتا ہے کہ اس کی مثنوی نظامی کی مثنوی سے کسی طرح کم نہیں ہے[4]

| | |
|---|---|
| چو نظم و لوئے من با نظام است | نظامی وار مقبولِ تمام است |
| مرا از طعنۂ حساد غم نیست | کہ نظمم از نظامی ہیچ کم نیست[5] |

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جالی کے منتخب اشعار کا اگر مقابلہ نظامی یا کسی دوسرے شہرہ آفاق شاعر کی تخلیق سے کیا جائے تو فیصلہ جالی کے حق میں ہوگا۔ لیکن جالی کا یہ دعویٰ کہ "نظم از نظامی ہیچ کم نیست" شاعرانہ تعلی سے زیادہ نہیں۔ مثنوی نگاری میں نظامی کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ جالی نے یہ مثنوی لکھ کر اس مقام تک پہونچنے کی کوشش ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ جامی کی ملاقات نے اس کی اس خواہش کے لیے تازیانہ کا کام کیا ہو۔ خسرو کی طرح جامی نے بھی اس فن میں نظامی کے مقام تک پہونچنے کی کوشش کی ہے،

---

[1] ایضاً ورق ۱۴ ب [2] ایضاً ۱۴ ب نشد میل دلم بر خوردہ کس [3] ایضاً ورق ۵ ب تا ۶ الف [4] ایضاً ورق ۱۵ ب [5] عصار کی مثنوی کا ورق ۱۴ ب بھی دیکھیے: دگر شیخ عیسیٰ دم نظامی / کہ بردے ختم شد شیریں کلامی

لیکن نظامی سے جامی کا کوئی تقابل ہی نہیں۔ جامی میں نہ تو نظامی کا حسن اندازہے نہ اس کی مثنوی کی ضخامت ہی نظامی کی مثنوی کے مقابلہ کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جامی نے نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں" کی پیروی حسن و خوبی سے کی ہے۔ جامی نے خود بھی نظامی کو استاد مانا ہے[1] ؎

| | |
|---|---|
| چہ لافم من کہ استادان ایں کار | ازیں نوع سخن راندند بسیار |
| تواریخ کہن افسانۂ تو | حدیث رستم و دستان خسرو |
| ز فردوسی و استاد نظامی | بہ نظم آمد معانی را تمامی |

۔ صاحب مخزن الغرائب نے اس مثنوی کی تعریف یوں کی ہے[2]

"اما مولانا جامی مثنوی خوب دارد" (باقی)

---

[1] مثنوی مہر و ماہ ورق ۱۴۰ ب [2] مخزن الغرائب ورق ۲۷، الف

فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

| | |
|---|---|
| نام مقام اشاعت | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نوعیت اشاعت | ماہانہ |
| نام پرنٹر | سید اقبال احمد |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نام پبلشر | " " " |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| اڈیٹر | سید صباح الدین عبد الرحمن |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نام و پتہ مالک رسالہ | " " " |

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد



# نعتیہ شاعری کی معنوی اہمیت

## اور

# ادبی قدر و قیمت

از ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد،

**فطرت انسانی پر حسن و احسان کا اثر اور شاعری میں اس کا ظہور**

انسان فطرۃً بندۂ حسن و احسان ہے، ہر حساس دل حسن و احسان کے جلووں پر فدا ہوتا ہے اور ان کی بدولت ہر قلب سلیم میں تحسین و تشکر کے جذبات حرکت میں آتے ہیں ممنونِ نظر اور رہینِ کرم اگر شاعر بھی ہو تو حسینوں اور محسنوں کی تعریف و تحسین کا دریا جب امنڈنے لگتا ہے تو یہ جذبات شعر و سخن کے دلربا رنگ روپ اختیار کرلیتے ہیں؛ اور عرض و نیاز کے یہ نغمے ادب کا سرمایۂ ناز بن جاتے ہیں۔

شعر حافظ را کہ یکسر مدح احسان شماست ‖ ہر کجا بشنیدہ اند از لطف تحسین کردہ اند

حسن کی ایک نظر اور کرم کی ایک امید بھی شاعر کو قصیدہ گوئی اور غزل سرائی پر ابھارتی ہے؛ فارسی غزل اور قصیدہ کے ارتقا کی ایک ایک کڑی اس حقیقت پر برہان قاطع ہے۔

**مشاہیر اور اکابر کی تعریف اور اس کی چند قسمیں**

انسانی فطرت اور شاعرانہ مزاج کو یہ موضوع اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ شاعر اور افسانہ گو اگر کسی نیم تاریخی یا تاریخی محسن و ممدوح کا انتخاب نہ کرسکا تو نظم، ڈرامہ، افسانہ یا ناول میں کچھ

خیالی کرداروں میں انسانی خوبیوں کا وہ رنگ بھرا کہ افسانہ پر اصل کا گمان ہونے لگا اور وہ ادبی کردار ضرب المثل نمونے بن گئے۔

شمۂ از داستان عشق شور انگیز ماست — این حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

**مذہبی پیشواؤں کی تعریف**

یہی وجہ ہے کہ قوموں کی شاعری کے ابتدائی شاہکار اکثر مذہبی پیشواؤں، انسانیت کے محسنوں اور مشاہیر قوم کی تعریف و تعظیم کے مضامین اور افکار پر مشتمل ہیں۔ راماین، مہابھارت، شاہنامہ اور ایلیڈ اس کی واضح مثالیں ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ عظیم الشان انبیاء کی تاریخی شخصیتوں تک پہونچتا ہے جن کی بدولت شاعری کو معنوی معراج نصیب ہوتی ہے۔

**انسانیت کے محسنوں میں انبیاء کا مقام**

انسانیت کے محسنوں میں انبیاء علیہم السلام کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے ایک موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی کی مجلس میلاد میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے نامور سائنسداں سر سی، وی، رامن نے فرمایا تھا

"انسانی زندگی کی تاریخ سے مہاتما بدھ حضرت مسیحؑ اور حضرت محمدؐ جیسے محسنوں کے نمونے اور ان کے اثرات کو نکال دو پھر دیکھو کہ انسانیت کے لئے فخر و ناز کا کیا سرمایہ رہ جاتا ہے"۔

**محققین تصوف کے لئے نعتیہ شاعری کی اہمیت**

تاریخ ادب سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف اور صوفیانہ ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری بھی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی، تصوف کے محققوں اور طالب علموں کے لئے بھی نعتیہ شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے اس سے خاص طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے نزدیک نبوت کا



کیا تصور ہے اعیان سے لے کر مختلف مدارج ظہور و کمال عروج میں نبی کا کیا مقام ہے؟

بڑے صوفی شعراء کی نعتیہ شاعری ان کے صوفیانہ مسلک و مشرب اور عارفانہ فلسفہ و حکمت کی تعلیم و تلقین کا ایک بنیادی اور مرکزی حصہ ہے حکیمانہ تصوف کے چند مرکزی تصورات ہیں۔

**صوفیا کی نظر میں عظمت انسان اور نعتیہ شاعری کا ربط**

تصوف کی انسان دوستی ایک مسلم حقیقت ہے روح انسانی کی عظمت اور انسانیت کی قدر و قیمت کے روح افروز نغمے سب سے زیادہ صوفی شعراء ہی کے کلام میں سنائی دیتے ہیں۔

صوفیانہ شاعری میں عظمت آدم کا یہی احساس ترقی کرتے کرتے فطری طور پر عظمت انبیاء کے عرفان تک بلند ہوتا ہے اور تعظیم انبیاء کے ادراک و اظہار کا یہ ارتقا خاتم الانبیاء کی رفعت ذکر یا نعت شریف میں اپنی معراج کو پہونچتا ہے یعنی نعت سرور انبیاء، صوفیانہ شاعری میں انسانی عظمت کی تحسین و تعریف کی معراج ہے۔

فارسی نعتیہ شاعری میں یہ نکتہ خاص طور پر توجہ کا محتاج ہے کہ اولین بڑے نعت گو شاعر حکیم سنائی ہی کے کلام میں عظمت آدم اور نعت کا فطری ربط نمایاں طور پر ملتا ہے۔

غرض عالم آدم از اول ؎ غرض آدمؑ احمد مرسلؐ[1]

اسی طرح آخری دور کے ایک نامور صوفی شاعر شاہ نیاز احمد بریلوی

---

[1] حدیقہ سنائی ص ۱۸۶

فرماتے ہیں

زہے عز و علائے منتہائے اوج انسانی ⁂ نبی یثربی، و مہبط تنزیل فرقانی[1]

**عبدیت اور الوہیت کا ربط**

تصوف کا مرکزی مسئلہ ربط الوہیت و عبدیت ہے صوفیا کے نزدیک انبیاء کرام شان عبدیت کے بہترین نمائندے اور تجلیات الٰہیہ کے بہترین مظہر ہیں، ان کے معارف علوم الٰہی کے ترجمان اور ان کے اخلاق، اخلاق الٰہی کا پرتو ہیں۔

**نعت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء کی نعت ہے**

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہی جاتی ہے تو صوفیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی ایک خاص اہمیت یہ بھی ہے کہ اس تعریف و توصیف میں تمام انبیاءؑ کی تحسین و نعت شامل ہے۔

نام احمدؐ نام جملہ انبیاست ⁂ چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست[2]

اسی طرح دوسرے انبیا کے محاسن و مکارم کے بیان میں بھی لازماً خاتم الانبیاءؐ کی تحسین مضمر ہوتی ہے۔

عارف رومی تو تمام انبیا پر لازمی ایمان کی توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی کل کے مربوط اور لاینفک اجزاء ہیں۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ[3] ہم رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے

چوں رسولاں از پے پیوستن اند ⁂ پس چہ پیوندند شاں چوں یکتن اند[4]

اس زاویہ نگاہ سے ہم اس ادب اور شاعری پر ایک نئی نظر ڈالنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس میں مختلف انبیاء کی تعریف و توصیف کی گئی ہے چاہے

[1] دیوان شاہ نیاز احمد ص ۳ [2] مثنوی دفتر اول ۹۲ [3] آیت ۲۸۵ سورہ بقرہ
[4] مثنوی دفتر اول ص ۲۵



وہ کسی زبان میں ہو اور کسی قوم کے نبی کی ہو۔

**عرفان رسول عرفان حق کا وسیلہ ہے**

نعتیہ شاعری میں حقائق محمدیہ کے مربوط تصورات موجود ہیں اکابر صوفیہ کے اندر عظمت، محبت اور اتباع نبوی کے جذبات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، ان کے نزدیک عرفان رسول ہی عرفان حق کا وسیلہ ہے؛

نیاز اندر دلت گر مہر عرفان خدا باشد ⁂ فدائے شان دلجوئے محمد شو محمد شو[1]

**اصلاح انسانیت میں نعتیہ شاعری کا حصہ**

انسان نے کائنات کی جس قدر تسخیر کی ہے اس تناسب سے اپنے آپ کو اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو حق و انصاف کے آگے نہ جھکا سکا، باہم جنگ و جدل کا یہی سبب ہے، اس حالت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد و اقوام کی نگاہ کو نسلی، جغرافی یا طبقاتی حدود سے بالاتر کر کے ان کے اندر ایک صحیح، قوی اور وسیع انسانیت اور متوازن سیرت کا جذبہ پیدا کیا جائے، اس کام میں اس ادبی سرمایہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جس میں سیرت انسانی کی بلند مثالیں اور محاسن پیش کیے جاتے ہیں۔ ان ادبیات میں شاعری کا وہ شعبہ سب سے زیادہ قیمتی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کے محاسن بیان کیے گئے ہیں۔

**متوازن سیرت اور نعتیہ شاعری**

نعتیہ شاعری فنی خوبیوں کے پیرایہ میں سیرت کا وہ مکمل نمونہ یا اسوۂ حسنہ پیش کرتی ہے جس میں جذبۂ تسخیر کائنات اور روح تسلیم بہ حق کمال حسن و تناسب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یعنی انسان ساری کائنات کو اپنے لیے جھکائے اور خود اپنے آپ کو حق کے آگے جھکا دے یہ اس کو پائدار اور ترقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایسی سیرتوں کا علم،

[1] دیوان شاہ نیاز احمد ص ۲۹

ان کی محبت اور اتباع اولین شرط ہے۔

**خارجی انقلاب، باطنی تربیت اور نعتیہ شاعری**

زندگی کے خارجی ماحول میں کوئی دیرپا انقلاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ نفس انسانی کے اندرونی احساسات و اقدار میں انقلاب نہ ہو۔ اس انقلاب حال کو بروئے کار لانے کے لیے نعتیہ شاعری سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے مضامین کا اکثر حصہ ان اخلاقی و روحانی حقائق اور اجتماعی اقدار پر مشتمل ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

**مختلف تہذیبوں کا باہمی تعارف اور نعتیہ شاعری**

اسی طرح مختلف قوموں اور تہذیبوں کے باہمی تعارف و تعاون کی ترقی کے لئے بھی ایسے ادب کے عمیق اور وسیع مطالعہ و اشاعت کی ضرورت ہے جس سے مختلف اقوام کے مقدس پیشواؤں کی انسانی خدمات اور تبلیغ و ہدایت کی عظمتوں سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ مدح انبیاء یا نعتیہ شاعری کا مطالعہ بھی ان مقاصد عالیہ کی تکمیل کا ایک نہایت اہم اور لطیف وسیلہ ہے۔

**ذاتی ذوق اور انتخاب موضوع**

میرے شخصی ذوق اور مزاج کو بڑے انسانوں اور مشاہیر کی تاریخ اور تعریف سے غیر معمولی شغف ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ خدا کی خدائی میں سب سے بڑی نعمت، بڑے انسان ہوتے ہیں اور سارے انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والتسلیم) انسانیت کی جان اور آدمیت کی شان ہیں۔ میری نگاہ میں تو ایک لحاظ سے سب سے بڑے آدمی جزواً جزواً کمالاتِ انبیاء ہی کا عکس ہوتے ہیں جن کا جامع مرکز حقیقتِ محمدیہ ہے۔



یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ؛ ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

**نعتیہ شاعری کی ادبی قدر و قیمت**

نعتیہ شاعری کا دامن بہار حدیقہ، نکات مخزن الاسرار، نور مطلع الانوار اور تحائف تحفۃ الاحرار سے ع دامان باغبان و کف گلفروش ہے۔ شاعری کے جس میدان میں سنائی نے حدیقہ آرائی کی، خاقانی نے قصیدہ خوانی کے جوہر دکھائے، نظامی نے نظم پر دین کا رنگ جمایا، عطار نے عطر بیزی سے مشام جان کو معطر کیا، رومی نے حکایت نے سنائی، سعدی نے سادگی و پرکاری کا ہنر دکھایا، خسرو نے شیریں سخنی کا خراج ادا کیا، جامی نے جس جام میں عکس رخ یار دکھایا، قدسی نے جس چمن قدس میں نغمہ خوانی کی، عرفی نے جس راستہ میں سر کو قلم بنایا، اور اقبال نے جس موضوع کی بدولت شعر و سخن کو بلند اقبال کیا، کیا کسی سخن شناس کو شاعری کے اس شعبہ کی معنوی رفعت، ادبی قدر و قیمت، اور شاعرانہ اہمیت سے انکار یا اختلاف ہو سکتا ہے، اس پر دلیل دینا تحصیل حاصل ہے۔

**نعتیہ شاعری مختلف اصناف سخن میں**

نعتیہ شاعری کسی ایک صنف شاعری میں محدود نہیں ہے، یہ ایک وسیع موضوع ہے اور ہر صنف سخن پر حاوی ہے۔ نعت نبوی میں قصیدے بھی لکھے گئے ہیں، مثنویات و غزلیات بھی لکھی گئی ہیں اور رباعیات بھی تحریر ہوئی ہیں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صوفیانہ اور نعتیہ شاعری نے ہر صنف سخن کی معنویت اور ادبیت کو بلند کرنے میں خاص حصہ لیا ہے، اگر فارسی شاعری کو صوفیانہ میدانِ فکر اور نعتیہ شاعری جیسے موضوع نہ ملتے تو لطافت اور نزاکت سخن کے یہ مدارج عالیہ اس کے نصیب میں کہاں آتے۔

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی ؛ چندیں سخن نغز کہ گفتی کہ شنیدی

# فقیہ ابو العماد شبلی

از

از عبد السلام قدوائی ندوی

انگریزی کے مشہور ادیب اور نامور مصنف واشنگٹن ارونگ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "جس طرح بڑے درخت کے سایہ میں چھوٹے پودے مرجھا جاتے ہیں اسی طرح بڑے آدمی کے زیر سایہ چھوٹے آدمی ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں" یہی حال علامہ شبلی کے ہمنام معاصر مولانا شبلی کا ہوا وہ اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت رکھتے تھے یوں تو تمام علوم مروجہ پر انھیں دسترس حاصل تھی لیکن فقہ و اصول میں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بڑی گہری تھی نحو پر تو اتنا عبور تھا کہ انھیں امام نحو کہنا مبالغہ نہ ہوگا اس علمی کمال کے ساتھ اصلاح و تربیت کا بہت اچھا سلیقہ تھا ساری عمر طلبہ کی نگرانی ان کے سپرد رہی تدریس کی ایسی مہارت تھی کہ بایدو شاید ان کی درسی تقریر بڑی واضح موثر اور دل نشین ہوتی تھی مشکل سے مشکل مباحث ان کے بیان سے پانی ہو جاتے تھے،

لیکن ان صلاحیتوں کے باوجود ان کا نام ہنوز غیر معروف ہے اور پچاس ساٹھ برس کی خدمات اب تک پردۂ خفا میں ہیں مجھے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ان کی تربیت سے بھی مستفیض ہوا ہوں ان کی رہنمائی میں کئی برس تعلیم و تربیت کی خدمت بھی انجام دی ہے اس لیے ان کو قریب سے دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور ان کے حالات و معمولات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے اس وقت ان کی وفات کو ۳۵ سال ہو چکے ہیں، رفقاء و احباب سب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، شاگردوں کی بڑی تعداد بھی ختم ہو گئی ہے ان حالات میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے دماغ میں جو واقعات محفوظ ہیں انھیں قلمبند کر دوں تاکہ نئی نسل ان کے حالات اور کارناموں سے واقف ہو جائے ممکن ہے کسی کے دل میں ان کی مثال نیک کو نمونہ عمل بنانے کا خیال ہو،



**خاندان اور پیدایش** مولانا کے والد شیخ محمد علی اعظم گڈھ کے مشہور گاؤں چیراج پور سے تعلق رکھتے تھے، ان کی زندگی یہیں بسر ہوئی، زمین داری ذریعۂ معاش تھی، اس کے ساتھ زراعت کا مشغلہ بھی تھا اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آرام سے گذر ہوتی تھی، مولانا شبلی یہیں پیدا ہوئے، سال پیدایش کے بارہ میں صحیح علم نہیں ہے تذکرہ نگاروں نے اس بارہ میں کچھ نہیں لکھا لیکن ان کی وفات بڑی کبر سنی کی حالت میں ہوئی تھی، اس وقت عمر اسی سے متجاوز تھی پچاسی سے کم نہ ہوگی، اس حساب سے سال پیدایش ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) ہوگا ممکن ہے دو ایک سال کم و بیش ہو لیکن زیادہ فرق نہ ہوگا۔

**ابتدائی تعلیم** اس زمانہ میں گاؤں گاؤں مدرسے قائم تھے جہاں ذی استعداد علماء درس دیتے تھے، اکثر اہل علم دور دراز کی درسگاہوں میں ملازمت پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے ہی وطن میں قناعت کے ساتھ رہتے اور اہل وطن کی خدمت کرتے، وہ گھر کے دال دلیہ کو باہر کے پلاؤ قورمہ پر ترجیح دیتے تھے ان نیک نفس، سادہ مزاج اور قناعت پسند بزرگوں کی بدولت پورب کا یہ علاقہ علم کا مرکز ہو گیا تھا

اور شیراز ہند کہلاتا تھا، مولانا عبد اللہ ایسے ہی صاحب ایثار لوگوں میں تھے
انھوں نے علوم مروجہ کی تعلیم مولانا محمد یوسف فرنگی محلی سے حاصل کی تھی جو ان
دنوں جون پور کے مدرسۂ حنفیہ میں مدرس تھے، مولانا محمد یوسف کے علاوہ مدرسہ
کے دوسرے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا، حدیث کی تعلیم میاں سید نذیر حسین سے حاصل کی
ان علوم دینیہ کے ساتھ طب کی تحصیل خاندان شریفی کے نامور طبیب حکیم محمود
خاں دہلوی سے کی تاکہ خدمت خلق کے ساتھ مصارف زندگی میں بھی اس سے مدد
ملے اس علم وکمال کے حصول کے بعد وہ اپنے وطن جیراجپور واپس آگئے اور یہیں
مسند درس بچھادی، تدریس کے علاوہ خالی اوقات میں مطب بھی کرتے تھے،

ان کا حلقۂ درس بہت مشہور ہوا، اطراف وجوانب سے طلبہ ان کی خدمت میں
حاضر ہوتے تھے اور اس دریائے علم سے سیرابی کے بعد اپنے اپنے اطراف میں تشنگان
علم کی پیاس بجھاتے تھے اس زمانہ کے متعدد نامور علماء ان کے شاگردوں کی صف
میں نظر آتے ہیں، مولانا سلامت اللہ، مولانا حیدر علی، مولانا عبد اللہ اور علامہ
شبلی سبھی نے ان سے اکتساب فیض کیا، صاحب تذکرہ مولانا شبلی بھی اردو نوشت و
خواند کے بعد ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور
فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

**مولانا عبد الحی فرنگی محلی کی خدمت میں**

اس زمانہ میں مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی کی بڑی شہرت
تھی، سارا ملک ان کے تبحر علم کا قائل تھا اور ان کی وسعت نظر، فکر عمیق،
قوت تدریس اور فصاحت بیان کا دور دور چرچا تھا، مولانا عبد اللہ بھی
ان کے علم وکمال کا ذکر کرتے رہتے تھے، یہ سن کر مولانا شبلی کو بھی لکھنؤ نے



کا خیال ہوا ان کے ایک بزرگ استاد اور مربی مولانا حفیظ اللہ مولانا عبد الحی کے
ممتاز شاگرد تھے، وہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں ان کے قریب ہی مقیم تھے اور ان کے
حکم سے کچھ درس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے ان کے سہارے مولانا شبلی لکھنؤ
پہونچے، مولانا عبد الحی بہت مصروف رہتے تھے، دور ونزدیک کے استفتوں کے جواب
اور اونچی کتابوں کے درس میں ان کا وقت گزرتا تھا، چھوٹی کتابیں ان کے
شاگرد پڑھاتے تھے، اس طرح مولانا شبلی عموماً اپنی درسی کتابیں مولانا حفیظ اللہ
سے پڑھتے تھے لیکن مولانا عبد الحی کی خدمت میں بھی کبھی کبھی باریابی کا موقع مل
جاتا اور ان کے مواعظ میں بھی شریک ہوتے، جمعہ کی نماز کے بعد عصر تک ان
کا وعظ ہوتا تھا، جو وسعت معلومات، حسن بیان اور قوت تاثیر میں بے نظیر ہوتا
تھا، مولانا شبلی اسباق کے علاوہ اس مجلس وعظ میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے،
طلبہ زیادہ تر فرنگی محل کے قرب وجوار کی مسجدوں میں مقیم ہوتے تھے، چوک
میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد خاصی وسیع تھی، بہت سے طالب علم اس میں قیام
کرتے تھے، مولانا شبلی بھی اسی مسجد میں رہتے تھے، اکثر طلبہ کے وظائف تھے، اور
خوشحال لوگ ان کی مدد کرتے تھے، لیکن مولانا شبلی نے اسے پسند نہیں کیا کہ اپنا
بار دوسروں پر ڈالیں، اس لیے جو کچھ والد بھیجتے تھے اسی پر گذر کرتے تھے زمانہ بھی
ارزانی کا تھا، کہتے تھے کہ دو روپے ماہوار گھر سے آتے تھے ایک روپیہ چھ آنے ماہوار
میں گوشت روٹی دال چاول دونوں وقت حسب دلخواہ باورچی کے یہاں سے
مل جاتے تھے اور جو ملازم کھانا لے کر آتا تھا دو آنے ماہوار اس کی اجرت ہوتی
تھی، اسی میں وہ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا اس کے بعد آٹھ آنے ماہوار

جو بچتے تھے ان میں مہینہ بھر کا جیب خرچ ہو جاتا تھا، عجب سستا زمانہ تھا، اس وقت کی ارزانی کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا، بھلا کون ایک روپیے کے ۴۵ سیر گیہوں، ڈھائی سیر خالص گھی، اور بارہ ۱۲ سیر بکری کے گوشت کا خیال کر سکتا ہے، پرانے بزرگوں کی یہ باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی کچھ جھلک تو میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھی ہے اور اس سے پچاس برس پہلے کا حال بزرگوں سے سنا ہے اسلیئے مولوی صاحب کے بیان پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ الغرض اس دور ارزانی میں وہ آرام سے زندگی بسر کرتے تھے اور اطمینان و دلجمعی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے، مولوی صاحب لکھنؤ کے قیام کے حالات، اور تعلیمی مشاغل کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے اور اس دور کے بعض طلبہ کی خدا ترسی اور پرہیزگاری کے حیرت انگیز واقعات سناتے تھے،

**رام پور کا قیام**

لکھنؤ میں مولانا کے اصل مربی اور استاد مولانا حفیظ اللہ تھے، وہ مولانا عبدالحیؒ کے نامور شاگرد تھے، اس لیے ان کی شہرت دور دور تک تھی، مدرسۂ عالیہ رامپور میں تدریس کے لیے ان کو بلایا گیا، انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی ان کے پیچھے مولانا شبلی بھی رام پور چلے گئے اور کئی سال وہاں قیام کر کے مولانا حفیظ اللہ اور دوسرے اساتذہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی، یہ نواب کلب علی خاں کا آخری دور تھا، ان کی قدردانی نے رام پور کو اہل علم و کمال کا مرکز بنا دیا تھا، مولانا ارشاد حسین جیسے فقیہ اور اہل دل، مولانا عبدالحق خیرآبادی جیسے علامۂ عصر، مولانا حسن شاہ جیسے محدث، مولانا ہدایت اللہ جیسے امام معقولات، منشی امیر مینائی، نواب مرزا داغ اور اسیر لکھنوی جیسے اساتذہ سخن کی موجودگی سے رام پور دار السرور ہی نہیں دار العلم والادب بھی بن گیا تھا اور اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی،



**اہل علم سے استفادہ**

اس فضا میں مولانا شبلی نے علم و فن کے مدارج عالیہ طے کیے، مولانا حفیظ اللہ پہلے مدرس تھے لیکن آگے چل کر صدر مدرس ہو گئے، ان کی اس ترقی نے ان کے شاگرد شبلی کی رسائی اور بڑھا دی اور انھیں مشاہیر علم و ادب سے استفادہ کا زیادہ موقع ملنے لگا،

**مولانا عبدالحق خیرآبادی کی خدمت میں**

مولانا عبدالحق خیرآبادی کی شان و تمکنت کا حال جن لوگوں کو معلوم ہے وہ جانتے ہیں، ان کی بارگاہ میں حاضری اور ان سے استفادہ ہر شخص کے بس میں نہ تھا، ان کی خودداری اور نازک مزاجی سے نواب کلب علی خاں، جیسے صاحب جبروت ڈرتے تھے، منشی امیر مینائیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نواب صاحب نے کہا کہ میں محرور المزاج ہوں، اس لیے مجھے غصہ آتا ہے تو اسے دبانا مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات ضبط کرنا پڑتا ہے تو حرارت ہو جاتی ہے، مولانا عبدالحق نے کہا بھلا وہ کون ہے جس کا آپ کو اتنا لحاظ کرنا پڑتا ہے تو فرمایا کہ ایک تو آپ ہی ہیں، پھر منشی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دوسرے یہ، منشی امیر مینائیؒ تو بڑے حلیم اور نرم مزاج تھے لیکن مولانا عبدالحق بڑے تیز اور حاضر جواب تھے، کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف ہو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور برجستہ کوئی فقرہ کہہ دیتے تھے،

نواب صاحب بچ کر جانے والے تھے خیال ہوا کہ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتے ہیں، شاید انھوں نے امام مالکؒ کے نامور شاگرد یحییٰ کا واقعہ سنا ہو کہ ایک مرتبہ کہیں سے کوئی ہاتھی آ گیا تھا، ہاتھی عرب میں نایاب ہیں، طلبہ نے سنا تو حلقۂ درس سے نکل کر سب اسے دیکھنے کے لیے چلے گئے، امام مالک نے یحییٰ سے کہا کہ تم بھی جا کر دیکھ لو، تمھارے ملک

اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتے ہیں لیکن یحیٰ نے عرض کیا میں یہاں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا ہوں میں تو اتنا دور دراز کا فاصلہ طے کرکے آپ کو دیکھنے اور آپ کی زبان سے حدیث نبوی کو سننے کے لیئے حاضر ہوا ہوں، نواب صاحب نے ارادہ کیا کہ اپنے ساتھ سفر حج میں ہاتھی لے جائیں تاکہ اس بھاری بھرکم جانور کو دیکھ کر عرب محظوظ ہوں اور حکم دیا کہ اس کے لیے انتظامات کیئے جائیں ایک دن مولانا عبدالحق کو انھوں نے اپنے اس ارادے سے مطلع کیا مولانا نے برجستہ کہا ایک اصحاب فیل پہلے مکہ معظمہ میں آئے تھے، اور دوسرے صاحب فیل آپ ہو لیے، یہ سن کر نواب صاحب کی طبیعت مکدر ہو گئی اور ہاتھی لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی قسم کی غمزہ بازیوں نے ایک مرتبہ نواب صاحب کو بے حد برافروختہ کر دیا اور مولانا نے رام پور چھوڑ دیا اس زمانہ میں اہل کمال کی قدردانی کا یہ حال تھا کہ فوراً مہاراجہ کشمیر نے اپنے یہاں جگہ دی لیکن وہاں رام پور والی بات کہاں تھی، ایک دن مہاراجہ کو خواہش ہوئی کہ علماء کا مناظرہ دیکھیں چنانچہ مولانا عبدالحق سے فرمائش کی کہ ایک صاحب علم سے کسی علمی مسئلہ پر ان کے سامنے بحث کریں، یہ بات مولانا کو بہت ناگوار ہوئی اور بگڑ کر کہا کہ مہاراجہ صاحب آپ نے مرغوں کی پالیاں دیکھی ہوں گی، یہ کہہ کر دربار سے چل دیئے، ادھر ان کے جانے سے نواب صاحب کو ملال تھا ہی یہ خبر ملی تو فوراً عزت و تکریم کے ساتھ بلا بھیجا، یہ واقعہ میں نے ریاض خیرآبادی مرحوم سے سنا ہے۔

ان حالات میں مولانا عبدالحق کی خدمت میں باریابی آسان نہ تھی، مولانا شبلی نے مولانا عبدالحق سے باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں پڑھی لیکن ان کی خدمت میں



آنا جانا ہوتا تھا، اس طرح ان کے خیالات سے واقفیت، ان کے علم سے استفادہ، ان کے لطائف و ظرائف سے محظوظ اور ان کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا، ان کے استاد مولانا حفیظ اللہ ریاست میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کا ایک بلند علمی مقام تھا، وہ علوم نقلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ میں بھی خاص درک رکھتے تھے اور ہیئت ریاضی اور منطق و فلسفہ میں بڑی شہرت کے مالک تھے، ان سے مولانا عبدالحق سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور بعض اوقات علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات بھی ہوتا، کبھی کبھی بحث بھی ہو جاتی تھی، مولانا شبلی اکثر ان مواقع پر موجود ہوتے اور ان دونوں بزرگوں کی گفتگو سے مستفید ہوتے، ہم لوگوں کو رامپور کے زمانۂ قیام کے حالات سناتے تو مولانا عبدالحق کے علمی کمالات کے ساتھ ان کی تمکنت نازک مزاجی، خودشناسی اور جرأت و بے باکی کے واقعات سناتے تھے،

**منشی امیر مینائی کا مشورہ**

مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مدرسۂ عالیہ رام پور کے اساتذہ کے علاوہ ادبی حلقوں سے بھی کسی قدر تعلق تھا، مولوی صاحب ادیب و شاعر نہ تھے لیکن سخن فہم تھے، منشی امیر مینائی کے یہاں بچوں کی تعلیم کی غرض سے زیادہ قیام رہتا، کہتے تھے کہ کئی سال ان کے مکان پر رہنے کا موقع ملا، منشی صاحب کے یہاں شعراء اور اساتذۂ سخن آیا کرتے تھے اور اکثر اپنا کلام سناتے تھے ان محفلوں کی شرکت سے مولوی صاحب کی ادبی واقفیت میں اضافہ ہوا، کبھی کبھی شعر کہنے کی بھی کوشش کرتے، ایک مرتبہ منشی صاحب سے اپنے اس شوق کا ذکر کیا، اور خواہش کی کہ وہ اس بارہ میں ان کی رہنمائی کریں، لیکن منشی صاحب نے ہمت افزائی نہیں کی اور فرمایا کہ غزل گوئی تو مشکل ہے، البتہ واقعات نظم

کرسکتے ہیں، مگر محنت کے باوجود اس میں بھی ترقی کا زیادہ امکان نہیں ہے، اس لیے بہتر ہے کہ شعر وسخن کے کوچہ میں قدم نہ رکھیں، بلکہ علوم وفنون کی طرف توجہ کریں اور معقولات و منقولات میں کمال حاصل کرکے درس و تدریس کو مشغلۂ حیات بنائیں،

اس نصیحت سے شاید وقتی طور پر کچھ صدمہ پہونچا ہو، مگر اس مشورہ نے ان کو ضیاع وقت سے بچا لیا اور انھوں نے شعر وسخن کو نظر انداز کرکے علوم اسلامیہ کی طرف پوری توجہ کی، اور ہمہ تن مطالعۂ کتب میں مصروف ہو گئے، فرماتے تھے کہ اتنی محنت کی کہ دماغ میں خشکی آگئی اور نیند غائب ہو گئی، مہینوں بے خوابی کی شکایت رہی اور بڑی دوا دوش سے یہ تکلیف دور ہوئی، ان کے گرد و پیش بڑے مخلص اور ہمدرد لوگ رہتے تھے، ورنہ جو دوائیں تجویز کی گئی تھیں ان کی فراہمی اور استعمال ممکن نہ ہوتا، مولوی صاحب کہتے تھے کہ چھ ماہ بڑی پریشانی اور بے چینی سے گذرے، بالآخر اللہ نے شفا بخشی اور مطالعہ پھر شروع ہو گیا،

**ملازمت** تعلیم مکمل ہو گئی تو ملازمت کا خیال ہوا، غازی پور میں چشمۂ رحمت عربی کا معروف مدرسہ تھا، یہ مدرسہ اب بھی موجود ہے، کسی زمانہ میں اس کی بڑی شہرت تھی، بڑے نامور علماء یہاں درس دے چکے ہیں، یہ مولانا شبلی کی شروع جوانی کا زمانہ تھا، مگر استعداد بڑی پختہ تھی، منتظمین مدرسہ نے انھیں پسند کیا اور ان کا تقرر ہو گیا، کئی سال وہ چشمۂ رحمت سے وابستہ رہے،

**ندوہ میں آمد** علامہ شبلی ان سے پہلے سے واقف تھے، ان کی لیاقت اور قوت تدریس



کا انھیں پورا اندازہ تھا، جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد مقرر ہوئے اور تعلیم کی دیکھ بھال ان کے سپرد ہوئی تو فقہ کی تعلیم کے لیے ان کی نظر مولانا شبلی پر پڑی اور اصرار کرکے انھیں لائے، اس وقت ان کا سال تقرر یاد نہیں آرہا ہے، شاید ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کا کوئی مہینہ تھا، علامہ شبلی ان کے نحوی کمال کے معترف اور فقہ و اصول میں ان کی وسعت نظر کے قائل تھے، انھیں مسائل پر بہت عبور تھا اور تدریسی صلاحیت غیر معمولی رکھتے تھے، علامہ ان کے علم اور کارکردگی کے بڑے قدرداں تھے اور پیچیدہ فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے،

علامہ شبلی کے علاوہ ندوہ کے دوسرے ارباب حل وعقد بھی ان کی قدر کرتے تھے، ارکان، مہتمم، اساتذہ اور طلبہ سبھی ان کی عزت کرتے تھے، انھوں نے پچاس سال کا طویل زمانہ ندوہ میں گذارا، اتنی طویل مدت تک سب کا اعتماد برقرار رکھنا آسان نہیں ہے، ندوہ میں بڑے انقلابات آئے، عہدہ داروں میں ردوبدل ہوا، ناظم بدلے، متعدد مہتمم آئے اور گئے، بیسیوں اساتذہ اور کارکنوں سے سابقہ ہوا، لیکن کبھی کسی سے چپقلش نہیں ہوئی، ان کی زندگی باہمہ اور بے ہمہ تھی، تکرار تو بڑی بات ہے، کسی سے کبھی شکر رنجی بھی نہیں ہوئی۔ خوشامد اور چاپلوسی کی عادت نہیں تھی، کبھی دربارداری نہیں کی، نہ ندوہ کے عہدہ داروں یا شہر کے صاحبان دولت و ریاست، وہ کسی کے گھر پر حاضری کے عادی نہیں تھے، کسی کام کے لیے بلائے جاتے یا کوئی ضروری مشورہ ہوتا تو چلے جاتے اور کام کے بعد واپس آجاتے، بات صاف اور بے لاگ کہتے، لیکن اس طرز عمل کے باوجود کوئی ان سے ناراض نہ ہوتا، لوگ ان کے اخلاص اور حسن نیت کے قائل تھے، اسی لیے ان کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے،

**بورڈنگ کی نگرانی** | تعلیم کے ساتھ طلبہ کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی، ملازمت کے آغاز سے سبکدوشی کے وقت تک برابر یہ خدمت انجام دیتے رہے، وہ بڑے لڑکوں کے بھی نگراں ہوتے تھے، اور چھوٹوں کے بھی، اس وقت عمارتیں زیادہ نہیں تھیں، اکیلی دارالعلوم کی عمارت ہی طلبہ کی قیام گاہ بھی تھی اور درس گاہ بھی، ہال میں تعلیم ہوتی تھی اور اس کے دونوں طرف کے کمروں میں طالب علم رہتے تھے، عموماً ایک طرف بڑے لڑکے رہتے اور دوسری طرف چھوٹے، دارالعلوم اتنا وسیع نہیں تھا، نہ ابتدائی درجات تھے نہ ثانوی، نہ دفاتر تھے، نہ مطبخ و مکتبہ، بس ایک درجہ فارسی کا تھا اور آٹھ عربی کے، ہال سے متصل مشرقی و مغربی جانب کے دونوں بڑے کمروں کی چھت نہیں تھی، ہر طرف دو دالان اوپر اور دو نیچے تھے، ان آٹھ دالانوں میں عربی کے درجے ہوتے تھے اور ہال کے ایک کونہ میں فارسی کی تعلیم ہوتی تھی، عربی کے پہلے درجہ میں اگر طلبہ زیادہ ہوتے تو ڈائس پر بھی ایک درجہ لگا دیا جاتا تھا، نمازیں سب ہال کے درمیان میں ہوتی تھیں روزانہ کی پنج وقتہ بھی اور جمعہ کی بھی،

آج اس تنگی سے گذر کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے اب تو بڑی بڑی متعدد عمارتیں بن گئی ہیں، اور اس کے باوجود تنگ دامانی کا شکوہ ہے، اب طلبہ کی تعداد بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے ۱۹۲۳ء میں جب میں دارالعلوم میں داخل ہوا، تو مولانا شبلی خورد کلاں سب طلبہ کے تنہا نگراں تھے، مطبخ کی دیکھ بھال بھی ان کے سپرد تھی، کھانا دارالطعام (ڈائننگ ہال) میں ہوتا تھا، اور مریضوں کے سوا سبھی طالب علم وہیں کھاتے تھے کھانا شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے مولانا وہاں پہنچ جاتے اور کھانا ختم ہونے کے ایک گھنٹہ بعد واپس آتے تھے، جاڑے



گرمی، برسات ہر موسم میں یہی مستقل معمول تھا، کھانے کی تقسیم میں ملازمین کا ہاتھ بٹاتے اور گھوم پھر کر دیکھتے رہتے کہ طلبہ اطمینان و خوش اسلوبی کے ساتھ کھا رہے ہیں اور کہیں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے، تقریباً بتیس سال مطبخ کا انتظام ان کے سپرد رہا، اس اثنا میں پہلی جنگ عظیم کا مشکل زمانہ آیا اور اس کے بعد سالہا سال اشیا کی گرانی اور نایابی کا دور دورہ رہا، لیکن مولانا کے حسن انتظام کی بنا پر طلبہ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے پائی نہ نفیس طعام میں غیر معمولی اضافہ ہو سکا، بورڈنگ میں طلبہ کی تربیت اور دیکھ بھال کی جانب بڑی توجہ رکھتے، بعض طلبہ اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ بعض اوقات بستر پر پیشاب کر دیتے تھے، مولانا بذات خود بستر دھلاتے اور انھیں صاف کپڑے پہناتے، بعض بچے والدین سے چھٹنے کی بنا پر غمگین ہوتے، انھیں تسکین دیتے اور اپنی پرلطف باتوں سے ان کا غم غلط کرتے، لیکن مولوی صاحب کی یہ شفقت ان کو بے راہ رو نہیں ہونے دیتی تھی، اللہ نے ان کا رعب ایسا دلوں پر قائم کر دیا تھا کہ کسی کو ان کی حکم عدولی کی جرأت نہ ہوتی تھی، ان کی ایک آواز سے لوگ کانپ جاتے، صبح کی اذان کے بعد اور عشاء سے پہلے وہ سارے بورڈنگ کا گشت کرتے اور لڑکوں کو نماز باجماعت کی تلقین کرتے، کبھی کسی اور وقت بھی آ جاتے، اس طرح طلبہ کے حالات اور ان کی ضروریات کی پوری خبر رکھتے، وہ شاید ہی کسی کو سزا دیتے ہوں، میں نے انھیں کبھی کسی کو مارتے نہیں دیکھا، زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیتے لیکن ان کی یہ ڈانٹ سو سزاؤں سے بھی بڑھ کر تھی، بڑے سے بڑے سرکش طالب علم لرز جاتے تھے، طالب علمی کے بعد بھی ان کے رعب میں کوئی کمی نہ آتی تھی، بلکہ زندگی بھر اس کا اثر رہتا تھا، میں نے متعدد ذی حیثیت اور صاحب اثر و رسوخ ندویوں کو دیکھا ہے کہ مولوی صاحب کے سامنے

ان پر طالب علمی کی وہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، مولانا مسعود علی بڑی آن بان کے ندوی تھے، ان کے سامنے اچھے اچھوں کو یارائے سخن نہ تھا، وہ ندوہ کی مجلس منتظمہ کے با اثر رکن بھی تھے اور ایک عرصہ تک سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے مگر مولوی صاحب کے سامنے ان کی ساری طاقت لسانی ختم ہو جاتی تھی، بڑی احتیاط کے ساتھ بولتے اور گفتگو میں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھتے مگر اس رعب و داب کے باوجود وہ کسی کو تکلیف نہیں پہونچاتے تھے اگر ان کو محسوس ہوتا کہ ان کی کوئی بات کسی کی دل آزاری کا باعث ہوئی تو اس سے معافی مانگنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

دبدبہ کے ساتھ ان کے اندر محبت و شفقت بھی بہت تھی، وہ ایک مربی اور معلم کی حیثیت سے طلبہ کے احتساب پر مامور تھے، کبھی کبھی انھیں تنبیہ و تادیب سے بھی کام لینا پڑتا تھا لیکن اس کے ساتھ انھیں خدا کے سامنے اپنے محاسبہ کا بھی ہر وقت خیال رہتا تھا، وہ روز جزا کی باز پرس سے ڈرتے رہتے اور کوشش کرتے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے، اس احساس نے ان کے اندر عفو و درگذر کا بڑا جذبہ پیدا کر دیا تھا، ان کا دل بغض و نفرت سے پاک تھا اور چاہتے تھے کہ دوسروں کے دل بھی ان کی طرف سے اسی طرح صاف رہیں، راقم الحروف نے بارہا انھیں اپنے خوردوں سے معافی مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔

**طلبہ کی عزت نفس کا خیال**

اوپر کی سطروں میں طلبہ اور ملازمین و ماتحتین کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کا ذکر آ چکا ہے، وہ سب کی عزت کا خیال رکھتے تھے اور کسی کی خودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے تھے، مدرسوں میں غریب طالب علم خاص طور



سے منتظمین کی زد میں رہتے ہیں اور ان کو دبا کر دوسروں پر دبدبہ قائم کیا جاتا ہے کمزوروں پر زور آزمائی دنیا کا عام دستور ہے مگر مولوی صاحب کا مزاج بالکل اس کے برعکس تھا، وہ کمزوروں کو نظر عنایت سے دیکھتے، محبت کے ساتھ پیش آتے اور کوشش کرتے کہ نہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگنے پائے نہ ان کی عزت نفس مجروح ہو، ندوہ کے بانیوں کے پیش نظر تھا کہ نادار اور خوش حال طلبہ کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جائے اور روزمرہ کی زندگی میں ایسا معمول رکھا جائے کہ غریبوں کو اپنی غربت و تنگدستی کی وجہ سے نہ کوئی پریشانی ہو، نہ ان کی آنکھ نیچی ہو، نہ ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو، اس طرز عمل کی بنا پر غیر مستطیع طالب علموں کے معیار زندگی کو اتنا بلند رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان کو دیکھ کر کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ غریب ہیں برسوں ایک ساتھ پڑھنے اور ایک ہی کمرہ میں رہنے کے باوجود پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون مستطیع ہے اور کون غیر مستطیع ان لوگوں کو دیکھ کر قرآن مجید کی یہ آیت یاد آتی تھی۔

یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف۔ خودداری کی وجہ سے ناواقف انھیں غنی سمجھتے ہیں۔

اس روایت کے قائم رکھنے میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا، وہ یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ طالبان وظائف کو درخواست کی منظوری کی اطلاع بھی بڑی پوشیدگی کے ساتھ دیتے تھے، بعض طلبہ اتنے غریب ہوتے تھے کہ کپڑے بھی نہیں بنا سکتے تھے ایسے لڑکوں کے لئے کپڑے اور جاڑے میں لحاف گدے بڑے اخفا کے ساتھ تیار رکھے جاتے اور رات میں جب سناٹا ہو جاتا تو چپکے سے ان کے پاس پہونچا دیئے جاتے، اسی طرح اس غرض سے

نقد رقم دلا دیتے یا کوئی ایسی ترکیب کرتے کہ اس کے ساتھی یہ نہ سمجھ پائیں کہ مدرسہ کی طرف سے یہ سامان فراہم کیا گیا ہے، کمال یہ تھا کہ آٹھ آٹھ سال ساتھ رہنے کے باوجود خوشحال طالب علم اپنے نادار ساتھی کی ناداری سے ناواقف رہتے، اس میں مولوی صاحب کی احتیاط کے ساتھ اس دور کے طالب علموں کے رکھ رکھاؤ کو بھی بڑا دخل تھا، وہ غریبی میں خودی کی نگہبانی کا ڈھنگ جانتے تھے، ان کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر اکثر زبان پر آجاتا تھا۔

غریبی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے　　کہ منعم کو گدا کے خوف سے بخشش کا نہ تھا یارا

**خطرہ میں پڑ کر دوسروں کی حفاظت** | طلبہ کو نقصان اور تکلیف سے بچانے کی بڑی فکر تھی ان کی حفاظت میں بعض اوقات اپنے کو خطرہ میں ڈال دیتے تھے، علامہ شبلی کی ندوہ سے علحدگی کے بعد دارالعلوم کے طالب علموں نے اسٹرائک کردی جس کا سلسلہ کئی مہینے جاری رہا، اخبارات نے پرزور مضامین لکھے، زعماء ملت نے مدلل بیانات دیئے، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، نواب علی حسن اور ناظر یار جنگ وغیرہ متعدد سربرآوردہ اصحاب نے علامہ کی حمایت میں غیر معمولی جد وجہد کی، ان حالات کی تفصیل حیات شبلی اور الہلال کے اوراق میں پڑھی جاسکتی ہے۔

اس زمانہ میں مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری ندوہ کے ناظم ہوگئے تھے، وہ علامہ شبلی کے حریف سمجھے جاتے تھے اس لیے یہ سارا ہنگامہ انھیں کے خلاف تھا، بڑی عمر کے سب طالب علم اسٹرائک میں شریک تھے صرف کچھ چھوٹے بچے دارالعلوم میں باقی رہ گئے تھے، مولانا شبلی ان لوگوں کے نگراں بھی تھے اور قائم مقام مہتمم بھی، ان بچوں میں



مولوی سعد الدین انصاری بھی تھے، اس وقت ان کی عمر دس بارہ سال کی تھی، ان کے بڑے بھائی پروفیسر عبد الباری ندوی علامہ کی حمایت میں سرگرم عمل تھے، اتفاق سے اس زمانہ میں سعد الدین صاحب نے بچوں کے کسی رسالہ میں ایک مضمون لکھا، مولانا عبد الباری نے چھوٹے بھائی کی ہمت افزائی کے لیے انھیں لکھا کہ تم نے خوب لکھا ہے، اس مضمون کا ندوہ کے اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہ تھا، مگر مولانا خلیل الرحمٰن کی اس خط پر نظر پڑی تو انھوں نے سمجھا کہ سعد صاحب نے ان کے خلاف مضمون لکھا ہے اور باز پرس کے لیے انھیں طلب کیا، مولوی صاحب لے کر گئے، سعد صاحب نے بہت صفائی دی، مولوی صاحب نے بھی یقین دلایا کہ یہ چھوٹا سا بچہ آپ کے خلاف کوئی مضمون نہیں لکھ سکتا ہے، مگر مولانا عبد الباری کے مخالفانہ رویہ کی وجہ سے مولانا خلیل الرحمٰن کا شبہہ دور نہیں ہوا اور سزا دینے کے لیے بید اٹھا لیا، یہ دیکھ کر سعد صاحب کے ہوش اڑ گئے، انھوں نے بھاگ کر مولانا شبلی صاحب کے دامن میں پناہ لی، مولانا خلیل الرحمٰن اس بات پر ان سے ناراض ہوگئے اور ان کی برخاستگی کا حکم دے دیا، مگر اتنے بڑے مدرس اور قائم مقام مہتمم کی علحدگی مجلس انتظامی کی منظوری کے بغیر محض ناظم کے حکم سے نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے یہ حکم نافذ نہ ہوسکا، مگر وہ اتنے خفا تھے کہ اپنے زمانۂ نظامت میں ان کی کوئی ترقی نہیں ہونے دی، یہ واقعہ مولوی صاحب کی زبان سے میں نے خود سنا ہے۔

**ذوقِ تدریس** | مولانا کو تدریس سے بڑی دلچسپی تھی، وہ بڑے شوق سے طلبہ کو درس دیتے تھے، مدرسہ کی طرف سے پانچ گھنٹے کی تعلیم ان کے سپرد تھی، لیکن وہ اس کے علاوہ شب و روز درس دیتے رہتے تھے، جس کا سلسلہ نماز فجر کے بعد ہی شروع ہوجاتا تھا، مولانا حفیظ اللہ اور ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں مرحوم صبح کی نماز غلس (اندھیرے)

میں شروع کرتے تھے، سلام پھیرتے وقت خاصی تاریکی ہوتی تھی، اس زمانہ میں ندوہ
میں بجلی نہیں آئی تھی، لالٹین جلاکر مولوی صاحب پڑھانا شروع کرتے تھے، یہ سلسلہ نو
بجے تک جاری رہتا، اسی دوران چائے بھی پی لیتے، نو بجے وہ مطبخ کی دیکھ بھال کے لیے
چلے جاتے، وہاں سے واپسی پر مدرسہ کے اسباق شروع ہو جاتے، عصر کے بعد مغرب
تک پھر پڑھاتے، عشاء کے بعد بھی دو ایک سبق ہوتے، تعطیل کے زمانہ میں بھی یہ معمول
اسی طرح جاری رہتا، بعض اوقات دارالعلوم کے طلبہ کے علاوہ دوسرے شائقین
علم بھی فیضیاب ہوتے

**کمالِ تقویٰ**

یہ خدمت وہ محض اللہ واسطے انجام دیتے تھے، اس بارہ میں کسی سے ایک
پیسہ کے بھی روادار نہ تھے، مدرسہ کے اوقات میں عموماً وہ فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم
دیتے تھے، کبھی نحو یا کسی اور فن کی کوئی کتاب بھی پڑھا دیتے، قرآن و حدیث کی تعلیم مقررہ
اوقات درس کے علاوہ دیتے، فرمایا کرتے تھے کہ میں ان خالص دینی علوم کی خدمت
پر کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا ہوں، اس لیے انھیں مدرسہ کے مقررہ اوقات میں نہیں
پڑھاتا ہوں، ہم لوگوں نے کہا پھر آپ فقہ کیوں درجہ میں پڑھاتے ہیں، فرمایا وہ اصل
دین نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت سے مجتہدین کے استنباط کردہ قوانین ہیں، ساری زندگی
ان کا یہ معمول رہا، کبھی اساتذہ کی قلت ہو جاتی تو مہتمم صاحب کے حکم پر مجبوراً قرآن
و حدیث کے کچھ سبق پڑھا دیتے تھے، مگر اس کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی۔

**طرزِ تدریس**

ان کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے طالب علم سے کتاب کی عبارت پڑھواتے
تاکہ اعراب درست ہو جائیں اور عبارت کی تصحیح ہو جائے پھر اسی سے ترجمہ کراتے،
ترجمہ بڑی حد تک لفظی ہوتا جسے وہ تحت اللفظ مگر بامحاورہ کہتے تھے، اس سے ان کا



مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو عبارت پڑھنے کا سلیقہ آجائے اور مطلب سمجھنے کی صلاحیت
پیدا ہو جائے، ترجمہ کی مہم سے فارغ ہو کر پھر وہ اس کی وضاحت کرتے، ان کی تقریر نہ
بہت مختصر ہوتی نہ بہت طویل، لیکن مطالب کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی سے ہو جاتی تھی،
اگر طالب علم کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تو اس کی مزید وضاحت کر دیتے، اس توضیح کے بعد
ایک بار پھر عبارت کی تشریح کر دیتے، وہ اپنی تقریر میں دور از کار مباحث سے احتراز
کرتے تھے اور طلبہ کی استعداد کے مطابق اظہار خیال کرتے، فرمایا کرتے تھے کہ استاد کو طلبہ
کے سامنے اپنی قابلیت کا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے، بلکہ ان کی ضرورت اور صلاحیت کو پیش
نظر رکھنا چاہیے، ان کے اس حکیمانہ طرز تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ کتاب کے مطالب بھی
بخوبی سمجھ لیتے تھے اور نصاب درس بھی مقررہ مدت میں پورا ہو جاتا تھا، انھوں نے ساٹھ
سال سے زیادہ درس دیا، مگر اس طویل عرصہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی کوئی
کتاب ختم ہونے سے رہ گئی ہو، عموماً امتحان سے ایک ماہ پہلے ان کا کام پورا ہو جاتا
اور طلبہ کو ایک بار پھر نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا۔

**مطالعہ کی اہمیت**

درسی کتابیں ان کو از بر تھیں، بعض اوقات ہم لوگوں سے کہتے کہ میں
زبانی پڑھوں اور تم اسے کتاب سے ملالو، مگر اس کے باوجود وہ پڑھانے سے پہلے
کتاب پر ایک نظر ضرور ڈال لیتے تھے، متاخرین کی کتابیں زیادہ پڑھانی پڑتی تھیں
اس لیے ان کے طرز تحریر سے بخوبی آگاہ تھے لیکن متقدمین کی کتابیں بڑے اہتمام سے دیکھتے
تھے، ہم لوگ کہتے کہ متاخرین کی دقیق اور پیچیدہ عبارتوں کی آپ اتنی فکر نہیں کرتے لیکن
متقدمین کی سہل اور واضح کتابوں کے مطالعہ کا اتنا اہتمام کرتے ہیں تو فرماتے کہ متاخرین
کی تصانیف تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں، ان کی پیچیدگی محسوس نہیں ہوتی ہے، مگر متقدمین

کی کتابوں سے سابقہ کم رہتا ہے، اس لئے ان سے طبیعت کم مانوس ہے طلبہ کو تاکید
کرتے تھے کہ درجہ میں جانے سے پہلے سبق پر ضرور نظر ڈال لیا کریں اور جہاں تک
ہوسکے حواشی کی مدد سے مطالب کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں تاکہ استاد کی
تقریر اچھی طرح سمجھ میں آسکے، مزید استفادہ کی صلاحیت پیدا ہو اور فہم مطالب
کی قوت بڑھے۔

**درس میں طلبہ کے نشاط کا خیال** | خشک علمی مباحث کو دیر تک سننا آسان نہیں ہے، ایسے
مواقع پر طلبہ عموماً غفلت و کسل کا شکار ہو جاتے ہیں، اس کیفیت کو دور کرنے اور
ذہنی بیداری اور حاضر دماغی پیدا کرنے کے لئے مولوی صاحب درس کے دوران دلچسپ
قصص و حکایات اور لطائف و ظرائف بیان کرتے تھے جو ذہنی نشاط کے ساتھ نصیحت
آموز بھی ہوتے تھے، مثلاً کسی نے عبارت پڑھنے میں کوئی اہم غلطی کی جس سے مفہوم بدل گیا
تو کہتے تیرا حال تو اس عطار کا سا ہے جس کی غلط خوانی نے غریب بڑھیا کو بے حال کر دیا
تھا، لڑکے پوچھتے مولوی صاحب کیا ہوا تھا تو فرماتے بھائی ایک بڑھیا کا لڑکا بیمار
ہوا تو وہ حکیم صاحب کے یہاں گئی اور حال بیان کر کے نسخہ لکھا لائی لیکن عطار تمہارے
دوست ہی کی طرح لائق تھے، انھوں نے شربت بنفشہ کو شربت بنفہ پڑھا اور بڑھیا
سے کہا حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ تو اس کی جان کو پی گئی پھر دانہ الائچی کو دانہ لاچی
پڑھ کر کہا اور وہ زندہ نہیں رہے گا، یہ سن کر بڑھیا رونے پیٹنے لگی، اتفاق سے کوئی
پڑھا لکھا آدمی ادھر سے گذر رہا تھا اس نے اس آہ وزاری کا سبب دریافت
کیا تو عطار کے ہاتھ سے حکیم صاحب کا نسخہ لے کر نظر ڈالی اور کہا مردے آدمی
اس میں جان کھا جانے اور زندہ نہ رہنے کا کہاں ذکر ہے تم نے شربت بنفشہ



اور دانہ الائچی کی مٹی پلید کر کے غریب بڑھیا کو ادھ مرا کر دیا۔

اس طرح ایک بار کسی صاحب کے تکیۂ کلام کے سلسلہ میں فرمایا کہ اس
سے بعض اوقات ایسا مطلب خبط ہو جاتا ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے، پھر فرمایا
ایک قاضی کو ہر بات میں، جو ہے سو ہے کہنے کی عادت تھی، ایک مرتبہ کہیں نکاح پڑھانے
گئے انھوں نے دولہا کو ایمان مفصل کی تلقین کی اور کہا پڑھو آمنت باللہ جو ہے سو ہے، اس نے اسی طرح پڑھا تو
قاضی صاحب نے کہا ہم جو کہیں جو ہے سو ہے تم نہ کہو جو ہے سو ہے کہو آمنت باللہ جو ہے
سو ہے، ابکے اس نے قاضی صاحب کی طرح ایمان مفصل کے ساتھ پوری عبارت دہرا دی،
اس پر قاضی صاحب بہت برہم ہوئے اور نکاح کو ناتمام چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح کے بہت سے لطیفے مولوی صاحب سبق کے اندر سناتے تھے اس سے
طلبہ کی عارضی غفلت بھی دور ہو جاتی تھی اور مستقل طور پر ان کی اصلاح بھی ہو جاتی تھی
لڑکے ان کے درس میں شوق سے شریک ہوتے اور خوش دلی اور حاضر دماغی کے
ساتھ ان کی تقریر سنتے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے پڑھی ہوئی کتاب ایسی ذہن
نشین ہو جاتی تھی کہ پھر کبھی فراموش نہ ہوتی اور برسوں دوسرے مشاغل میں انہماک
کے باوجود جب پڑھانے کا اتفاق ہوتا تو کوئی دشواری محسوس نہ ہوتی۔

**نظام کی پابندی** | وہ مدرسہ کے قواعد و ضوابط کے بہت پابند تھے، جو کام سپرد کیا جاتا خوش
اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے، بیماری میں بھی جہاں تک ہوسکتا اسباق کا ناغہ نہ کرتے، بستر
علالت کے پاس طلبہ جمع ہو جاتے اور لیٹے لیٹے پڑھا دیتے، آخر زمانہ میں کئی سال وجع مفاصل کی
وجہ سے نقل و حرکت دشوار تھی مگر تکلیف کے باوجود برابر درس دیتے رہے اور نگرانی کے
فرائض بھی انجام دیتے رہے، افسروں کے احکام کی بجا آوری میں کبھی کوتاہی نہیں کی، ان کی

طویل مدت ملازمت کے زمانہ میں کئی ناظم بدلے اور متعدد مہتمم آئے مگر انھوں نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا وہ مشورہ کے وقت صفائی کے ساتھ اپنی رائے دیتے تھے پھر اس کے بعد ناظم و مہتمم جو حکم دیتے تھے اس کی تعمیل کرتے تھے، وہ امیر کی اطاعت سے انحراف پسند نہیں کرتے تھے اس بارہ میں وہ خورد و کلاں کے درمیان امتیاز کے قائل نہ تھے مہتمم کو ہر حال میں مہتمم سمجھتے تھے، خواہ ان کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو مولانا محمد عمران خاں ان کے بچوں کی طرح تھے جب وہ دارالعلوم میں داخل ہوئے تھے تو ان کی عمر بارہ سال کی رہی ہوگی مگر جب مصر سے واپسی کے بعد وہ مہتمم ہوئے تو ان کا پورا احترام کرتے تھے اور بے تامل ان کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، عمران خاں صاحب عرض کرتے کہ میں تو آپ کا ادنیٰ خادم ہوں، مجھے مہتمم کے بجائے عمران کہہ کر مخاطب کیا کیجئے، مگر مولوی صاحب نے اپنا طرز کلام نہیں بدلا اور برابر مہتمم صاحب کہتے رہے، فرماتے تھے کہ میں تو عہدہ کا احترام کرتا ہوں اطاعت و انقیاد کی مثال ایسی مشکل سے کہیں اور ملے گی، جس زمانہ میں چھوٹے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوں اور خورد بزرگوں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہوں اس زمانہ میں مولوی صاحب کی روش حیرت انگیز ہے، اگر اس کا رواج ہو جائے تو جماعتیں اور ادارے شکست و ریخت سے بچ جائیں، ملت کی پراگندگی دور ہو جائے، اور انتشار کے بجائے قوم کے اندر نظم و ضبط اور اجتماعیت و استحکام پیدا ہو۔

**حلیہ اور وضع قطع** مولوی صاحب لانبے قد اور کسی قدر دہرے بدن کے تھے، سینہ چوڑا، ہڈی چکلی، چہرہ بڑا اور کسی قدر گول تھا، داڑھی گھنی، آنکھیں بڑی، رنگ سانولا اور آواز بلند تھی، قدم زمین پر زور سے رکھتے اور پانوں کچھ گھسیٹتے ہوئے چلتے، لباس بہت معمولی استعمال کرتے تھے، موٹے کپڑے کی دوپلی ٹوپی، لانبا کرتا اور تہبند یہی ان کی پوشاک تھی اکثر ایک



بڑا رومال ساتھ رکھتے، جاڑوں میں روئی دار شلوکہ اور روئی دار پائجامہ پہنتے تھے مگر اتباع سنت کے خیال سے تہبند اس موسم میں بھی ترک نہ کرتے اور پائجامہ کے اوپر پہن لیا کرتے تھے، بال نہ کترواتے نہ منڈاتے بلکہ پٹوں کی شکل میں گردن تک رکھتے، پانوں میں معمولی سی چپل ہوتی لیکن اس سادگی کے باوجود اللہ نے بڑا وقار عطا کیا تھا، کھانا سادہ ہوتا تھا گوشت بہت مرغوب تھا اور ترکاریوں میں کریلے پسند تھے بڑے اہتمام سے پکاتے، طلبہ کو بھی کھلاتے پان کے عادی تھے، ڈبیہ ساتھ رہتی حقہ بھی پیتے تھے اور چائے کا بھی شوق تھا، بلی اور بکری سے دلچسپی تھی لیکن جب بورڈنگ کے آس پاس آم کا باغ لگا تو بکریاں ختم کر دیں تاکہ درختوں کو نقصان نہ پہونچے۔

**اخلاق و عادات** مہمان نواز بہت تھے، اور صلہ رحمی کا بڑا خیال تھا، لڑکے کا انتقال ہو گیا تھا مگر پوتے، نواسے اور دور و نزدیک کے عزیز خاصی تعداد میں ان کے ساتھ رہتے تھے خاندان کے بہت سے لڑکوں نے ان کی بدولت اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی، عزیزوں کے علاوہ احباب اور اہل تعلق کے بچے بھی ان کی فیاضی سے مستفید ہوتے تھے، چھوٹے اور غریب لوگوں کا خاص خیال رکھتے، لیکن کبھی کسی سے خدمت نہیں لی۔

**مذہبی زندگی** فرائض، واجبات اور سنن کا بڑا اہتمام تھا، نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے ایک زمانہ میں پانوں میں شدید اکوتہ تھا، بڑھاپے میں وجع مفاصل کی تکلیف ہو گئی تھی لیکن جماعت کی پابندی کبھی نہیں چھوڑی البتہ جب باقاعدہ بیٹھنے میں دقت ہونے لگی تو چہار زانو بیٹھنے لگے، گرمی بہت ہوتی تو کرتے کے بجائے بنیان پر اکتفا کرتے۔

باقاعدہ اذکار و اشغال کرتے تو نہیں دیکھا لیکن نماز کے بعد کچھ دیر وظیفہ ضرور پڑھتے تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے عزیز خاص خواجہ احمد نصیر آبادی سے بڑی عقیدت

تھی شاید ان کے مرید بھی ہوں، بدعات سے شدید اجتناب تھا، مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے، مگر حنفیت میں غلو نہیں تھا۔ دوسرے ائمہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اہل حدیث سے بھی سوء ظن نہیں تھا، ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اور مولانا عبد اللہ اہل حدیث تھے، برادری میں بزرگوں میں مولانا سلامت اللہ اور ساتھیوں میں مولانا عبد الغفور اور ندوہ کے مدرسین میں شیخ تقی الدین ہلالی بھی سلفی تھے۔ شاگردوں میں قاری محمد منیر وغیرہ متعدد اصحاب غیر مقلد تھے، مولوی صاحب ان سب سے محبت و حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتے، یہ غالباً مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور ان کے شاگردوں کا اثر تھا، ان کے اندر بڑا توسع تھا، دلائل سے متاثر ہو کر کہیں کہیں دوسرے ائمہ کی رائے کو اختیار کر لیتے تھے، مثلاً سری نمازوں میں وہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، عصر کی نماز ایک مثل پر جائز سمجھتے تھے۔

روزے بڑے اہتمام سے رکھتے تھے، رمضان شریف میں شب بیداری کا معمول تھا، تراویح کے علاوہ تہجد بھی پڑھتے اور دعا و مناجات میں کچھ وقت صرف کرتے، پھر اول وقت فجر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کرتے، عیدالاضحیٰ میں قربانی بڑے اہتمام سے کرتے، ندوہ میں ہوتے تو طلبہ کو بھی دعوت دیتے اور بڑی شفقت کے ساتھ کھلاتے۔

**فرنگیت سے بیزاری**

مولانا سیاسی آدمی نہیں تھے، انھوں نے وقت کی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا، مگر اپنے بزرگوں اور استادوں سے انگریزوں کے جو مظالم سنتے تھے اور ان کے ہاتھوں جس طرح مسلم حکومتیں برباد ہوئیں اور اسلامی تہذیب و روایات کو صدمہ پہنچا، اس کی بنا پر ان کے اندر فرنگ بیزاری بہت تھی اور اسے باعث نجات سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ تین باتوں کی وجہ سے مغفرت کا امیدوار ہوں، ایک تو یہ کہ میں کسی سے بغض



نہیں رکھتا، دوسری یہ کہ میں نے کبھی کسی انگریز سے ہاتھ نہیں ملایا اور تیسری بات یہ کہ انگریزی الفاظ مجھ سے صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے ہیں، اس مسئلہ میں ان کا یہ حال تھا کہ انسدٹ اور سٹیفکٹ جیسے روزمرہ کے الفاظ بھی وہ صحیح نہیں استعمال کرتے تھے، فاؤنٹین پن کو ہمیشہ سیاہی دان کہتے تھے، انگریزی جوتے، انگریزی ٹوپی، انگریزی لباس کے بھی عجیب نام رکھے تھے، ممکن ہے آج یہ باتیں تعصب پر محمول کی جائیں لیکن جن لوگوں کو برطانوی مظالم سے واقفیت ہے اور انگریزوں کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کا تجربہ ہے وہ مولوی صاحب کو اس بارہ میں حق بجانب سمجھیں گے۔

**غیر درسی کتابوں کا مطالعہ**

مولوی صاحب کا زیادہ وقت تدریس میں گذرتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ غیر درسی کتابوں پر بھی نظر رکھتے تھے اور اہم مطبوعات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے فقہ واصول اور تفسیر وحدیث کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی، ادب سے زیادہ ربط نہ تھا، مگر جب اساتذۂ ادب کی کمی ہوتی تو ادبی کتابیں بھی پڑھا دیتے تھے، میرے زمانۂ درس میں ایک بار انھوں نے مقامات حریری پڑھائی تھی، بلاغت کی فنی کتابیں مختصر المعانی وغیرہ تو عموماً وہی پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ ایک عرب استاد کے سپرد یہ کتاب ہوئی، شروع کی تمہیدی عبارت تو انھوں نے پڑھا لی لیکن جب ضیفنا تشک اور فیہ نظر وغیرہ سے دوچار ہوئے تو کتاب پھینک دی۔

اخبارات ورسائل سے دلچسپی نہ تھی مگر کبھی کبھی سرخیوں پر نظر ڈال لیتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں اودھ پنچ پڑھا تھا، کبھی کبھی اس کے ظریفانہ فقروں کا ذکر کرتے تھے، اردو کتابوں سے زیادہ تعلق نہ تھا، لیکن اہم کتابوں سے یک گونہ واقفیت تھی، اس زمانہ میں سید علی بلگرامی نے لیبان کی کتاب کا ترجمہ تمدن عرب کے نام سے شائع کیا تھا، اس میں

عہد اسلامی کے تمدنی کارناموں کا ذکر ہے، اس لیے مسلم حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا، مولوی صاحب نے اس کا غور سے مطالعہ کیا اور تعریف کے اندر چھپی ہوئی تنقیص محسوس کرلی، فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسے ملا ہی اس زہر کا پتہ چلا سکتے ہیں جو شکر کی گولیوں کے اندر رکھا ہوا ہے۔

**زبان و بیان** | مولوی صاحب کی افتاد مزاج اور طرز زندگی کا ذکر ہو چکا ہے، وہ نہ خطیب بلند بانگ تھے نہ واعظ خوش بیان، ان کے اندر نہ شاعروں کی شیریں نوائی تھی نہ ادیبوں کی سحر طرازی، وہ نہ مرشدوں کی شان رکھتے تھے نہ عالموں کی آن بان، بڑی سادگی سے رہتے اور بے تکلفی سے بات کرتے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا، طالب علمی کا زمانہ اہل زبان کے درمیان بسر ہوا، رام پور میں سالہا سال منشی امیر مینائی کے یہاں آمد و رفت رہی، لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کی نفاست اور حسن بیان سے بے تعلق رہے، سادہ زبان میں بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے جس میں کہیں کہیں ان کے وطن کا رنگ آجاتا، ایک مر کہنے لگے ہاتھی آئی ہے ہم لوگ ہنس پڑے، فرمایا بھائی ہم تمہارے ہاتھی کو ہاتھا اور تمہاری ہتھنی کو ہاتھی کہتے ہیں، مسجد کو کبھی کبھی روانی میں مجت کہہ دیتے تھے، لہجہ میں بھی کبھی پورب کی جھلک آجاتی تھی لیکن چند مستثنیٰ الفاظ کے علاوہ وہ عموماً لکھنؤ ہی کی زبان بولتے تھے۔

**تفہیم و اصلاح خیال** | لیکن اس سادگی کے باوجود ان کی مجلس میں جی لگتا تھا، اور بعض اوقات ان کی باتوں سے طبیعت کی الجھن دور ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ علماء کے اختلافات پر لوگ اظہار افسوس کر رہے تھے، اس پر فرمایا کہ مناظرانہ نقطۂ نظر کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ اختلاف اللہ کی رحمت نظر آئے گا، اگر مجتہدین کے درمیان یہ اختلاف نہ ہوتا تو مسائل کی یہ کثرت کہاں سے ہوتی، دین کی ابدیت کا تقاضا ہے کہ اس کے اندر وسعت ہو،



تاکہ قیامت تک شریعت کے دائرہ میں تنگی محسوس نہ ہو اور ہر دور میں عمل کی راہیں کشادہ نظر آئیں۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ بڑا پر آشوب تھا، دنیا میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا، رہ رہ کر خیال آتا کہ ہم اس مصیبت کے زمانہ میں کیوں پیدا ہوئے، ایک دن مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ انداز فکر صحیح نہیں ہے، پیدائش تمہارے اختیار میں نہ تھی جو ہونا تھا ہو چکا اب تو یہ سوچنا چاہئے کہ ان حالات میں تمھیں کیا کرنا چاہئے، اس طرح فضل خداوندی پر اعتراض بھی نہ ہوگا اور ان مشکلات کے حل کی تدابیر بھی سمجھ میں آئیں گی۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ کے وقت اکثر افسوس ہوتا ہے کہ ہم عہد رسالت اور دورِ صحابہ میں کیوں نہ ہوئے کہ مراتب عالیہ حاصل کرتے، ایک مرتبہ مولوی صاحب کے سامنے اس کا ذکر آیا تو فرمایا کیا ضرور ہے کہ تم ابوبکرؓ و عمرؓ ہی ہوتے آخر ابوجہل و ابولہب بھی تو اسی زمانہ میں تھے، میاں جس حال میں ہو خدا کا شکر کرو، مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، صحیح الخیال ماحول ملا، دین کا علم حاصل ہوا اور کیا چاہئے اب عمل صالح اختیار کرو اللہ دین و دنیا میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

**فتاوی** | مولانا زندگی بھر درس دیتے رہے، تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار نہیں کیا، اس لیے کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی مگر ان کے فتاوی بڑی اہمیت رکھتے تھے فقہ کی جزئیات اور اصول پر ان کی وسیع نظر تھی، وہ مجتہدین کے طرق استنباط کو خوب سمجھتے تھے، ان کے اندر حالات پر روایات کے انطباق کی اچھی صلاحیت تھی، وہ استفتوں کا جواب بڑی دقت نظر اور دیدہ وری کے ساتھ دیتے تھے، ان کے فتوے بڑی تعداد

میں تھے، ان کے نواسے اور ندوہ میں ان کے جانشین مفتی محمد سعید مرحوم نے بتایا تھا کہ یہ کئی جلدوں کے بقدر ہیں معلوم نہیں یہ ذخیرہ اب کہاں ہے، ندوہ کے موجودہ مفتی مولانا محمد ظہور صاحب سے جو مولوی صاحب اور مفتی صاحب مرحوم کے عزیز بھی ہیں میں نے دریافت کیا مگر پتہ نہیں چلا،

**وفات** جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مولانا آخر میں بیمار رہنے لگے تھے، اکوتہ اچھا ہوا تو وجع مفاصل میں مبتلا ہوئے، جب تک تھوڑی بہت سکت رہی دار العلوم ہی میں قیام رہا اور مقررہ اسباق پڑھاتے رہے، لیکن جب بیماری اور کمزوری نے بالکل مجبور کر دیا تو گھر چلے گئے، اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہاں ۲۶ شعبان ۱۳۶۴ھ (۵ اگست ۱۹۴۵ء) میں وفات پائی۔ غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ مثواہ،

---

## تذکرۃ المحدثین

سلسلہ سیرۃ النبی، سلسلہ سیر الصحابہ، سلسلہ تابعین و تبع تابعین کے بعد محدثین کرام کے حالات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگا، اس کی ایک جلد ہندوستان کے محدثین پر ہوگی، جو زیر ترتیب ہے، دو جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، پہلی جلد دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات اور ان کی حدیثی خدمات پر مشتمل ہے، دوسری جلد چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

مرتبہ۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی قیمت فی جلد ۱۳ روپے ۵۰ پیسے



## مطبوعات جدیدہ

**الحاوی علی مشکلات الطحاوی** مرتبہ مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب تقطیع متوسط کاغذ بہتر کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۴۴۲ قیمت بارہ روپے پتے (۱) موتمر المصنفین اکوڑہ خٹک پشاور، پاکستان (۲) کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارن پور

امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) مشہور فقہائے احناف میں تھے، حدیث اور شرح حدیث میں بھی وہ بہت ممتاز تھے، ان کی تصنیفات میں "معانی الآثار" فقہ و حدیث کی جامع ہونے کی بنا پر زیادہ اہم خیال کی جاتی ہے، اس کی متقدمین نے جو شرحیں لکھی تھیں وہ نایاب ہیں، اور شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف رح کی شرح بعد میں تحریر کی گئی، اس لیے جب معانی الآثار مظاہر العلوم سہارن پور کے نصاب میں داخل کی گئی اور اس کے درس کی خدمت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری کو تفویض کی گئی تو وہ اس کے متعلق اپنے شکوک و اشکالات قلمبند کر کے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے پاس بھیج دیتے، وہ جواب تحریر کر کے مولانا عبد اللطیف ناظم مدرسہ اور دوسرے علماء کے پاس بھیج دیتے، یہ حضرات بھی اپنی رائیں تحریر کر دیتے، اگر اس کے بعد بھی مولانا کامل پوری کو تشفی نہ ہوتی تو وہ دوبارہ ان حضرات کے پاس بھیج کر جواب طلب کرتے، اب اسی سوال و جواب کو جو متفرق اور منتشر حالت میں تھا، مولانا عبد الرحمٰن مرحوم کے فرزند قاری سعید الرحمٰن صاحب نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس طرح

زیر نظر کتاب میں ۹۸ اٹھانوے اشکالات مع جواب درج ہیں، پہلے امام طحاوی کی اصل عبارت مع حوالہ نقل کی گئی ہے، پھر اسکے متعلق اشکال اور آخر میں جواب ناموں کی تصریح کے ساتھ درج ہے۔ مگر جواب میں یکسانیت نہیں ہے کچھ اردو اور کچھ عربی میں ہیں، اگر عربی جواب کا اردو ترجمہ کر دیا جاتا تو فائدہ دو چند ہو جاتا اردو جواب کی زبان اور پیرایۂ بیان قدیم طرز کا ہے تاہم اس کتاب سے حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا

**روح البیان** (حصہ دوم) از مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۰ سر قیمت بارہ روپے ناشر ڈاکٹر ابرار احمد نمبر ۵ سلطان پور بھادا، الہ آباد

مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھی حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ حضرت شاہ بدر علی کے خلیفہ اور خود ایک بڑے شیخ طریقت ہیں، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی وفات کے بعد ان کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی ہے، مشرقی یو۔پی کے لوگوں کو خاص طور سے ان سے بڑا فیض پہنچ رہا ہے، مولانا کے عقیدت مندوں نے افادۂ عام کے خیال سے ان کے مواعظ کا ایک مجموعہ پہلے شائع کیا تھا اور اب یہ دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں رضائے الٰہی کے حصول، آخرت کے استحضار، کتاب و سنت کے اتباع، ذکر، تلاوت و عبادت میں مشغولیت، اخلاق و معاملات کے تصفیہ قلب کے تزکیہ، نیت کے اخلاص، عمل کی اصلاح، صلحاء کی صحبت اور اہل اللہ کی ہم نشینی وغیرہ کی تلقین پُر اثر انداز میں کی گئی ہے، مواعظ کو پڑھ کر قلب میں گداز روح میں بالیدگی، دل میں عمل کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور آخرت کی فکر میں اضافہ ہوتا ہے، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مختصر مقدمہ اور ایک وعظ کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی موثر تعارفی تقریر بھی ہے، زبان آسان اور عام فہم ہے تاکہ ہر ذوق و استعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ "ض"

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۹ء عدد ۴

## مضامین



## مقالات



## وفیات



## باب التقریظ والانتقاد